اردو دنیا
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

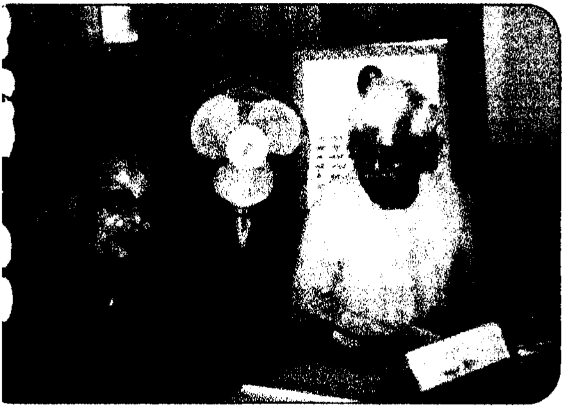

مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل اور قومی اردو کونسل کے
چیئرمین جناب ارجن سنگھ، قومی اردو کونسل کی مجلس عاملہ کی
چودھویں سالانہ میٹنگ کی صدارت فرماتے ہوئے۔ ساتھ
بیٹھے ہیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید۔ مجلس
عاملہ کے بعد مجلس عام کی میٹنگ بھی ہوئی۔

وزیر محترم جناب ارجن سنگھ ڈاکٹر علی جاوید سے مخاطب
ہیں۔ تصویر میں جوائنٹ سکریٹری لینگویجز جناب یہ
دیوراج اور محترمہ نیلم کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

بائیں سے: جناب کمال فاروقی، پروفیسر شہریار، جناب
زبیر رضوی اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی۔

ماہ نامہ
اردو دنیا نئی دہلی
جلد۔9، شمارہ۔8 اگست 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔ 88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26169416, 26109746

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 4

زبان اور تعلیم
● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمٰن فاروقی 6
● اردو: مضمون کے ذریعۂ تعلیم .... خالد سعید 9
● غیر اردو دانوں کے لیے اردو رسم الخط کا تعارف .... حیات افتخار 12
● مغربی بنگال میں اردو کی صورت حال .... وجیہہ الدین جمال 14
● ایکوسیٹ: تعارف و تجزیہ .... دویا گاندھی 16

ادب
● فن میں مقصدیت، ارسطو کی نظر میں .... شرجیل احمد خاں 18
● آغا حشر کاشمیری کی شاعری (غزل گوئی کے حوالے سے) .... شہپر رسول 20

تاریخ و ثقافت
● دلی کالج، مشرقی و مغربی علوم کا سنگم .... زبیر رضوی 23
● پھول والوں کی سیر .... ضیاء الرحمٰن غوثی 25
● بہادر شاہ ظفر اور 1857 .... جبار علی رضوان انصاری 29

صحت، ماحولیات اور سائنس
● پینٹ دینے میں سختی کی ضرورت .... بھرت جھن جھن والا 33
● خفقان — اختلاج قلب .... عتیق الرحمٰن عبد العظیم 34
● ماحول کے مضر صحت اثرات .... نورالدین قریشی 36
● گنگا — ہندوستان کی مقدس ندی .... اقبال محی الدین 37
● جینیٹک انجینئرنگ سے مٹر کی افزائش .... احسان اللہ احمد 39

روبرو
● کرشن چندر سے ایک مکالمہ .... مشتاق اعظمی 41

سفرنامہ
● شمالی امریکہ کا سفر .... شائق احمد یحییٰ 43

کیریئر
● ویب مینجمنٹ .... آرتی شری واستو 52

ہماری مطبوعات سے
● نظیر اکبرآبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقا .... سید احتشام حسین 53
اردو خبرنامہ .... ادارہ 57
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 71

بچوں کا گوشہ
● چھتری کی کہانی .... خسرو متین 77
● بچوں کا گیت .... سوہن راہی 79

آپ کی بات

■ ڈاکٹر صاحب علی، شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، رانا ڈے بھون، ودیا نگری، سانتا کروز (ایسٹ)، ممبئی-400098

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ ایک ایسا عہدہ ہے کہ اس کے لیے فعال اور متحرک شخص کا ہونا ضروری ہے تاکہ اردو زبان و ادب کی ہمہ جہت ترویج و ترقی ہوتی رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اہم عہدے پر آپ کا تقرر اسی لیے عمل میں آیا ہے کہ زبان و ادب کے آپ ایک فعال اور سرگرم اسکالر ہیں۔ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے پر میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ پورے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی جڑیں مزید مضبوط ہوں گی اور پھیلیں گی بھی خوب۔

■ سوہن راہی، 63 ہیملٹن ایونیو، سربیٹن، سوری، KT6,7PW، انگلینڈ

سب سے پہلے تو میں آپ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ امید کہ آپ کی رہنمائی میں اردو کونسل ایک باوقار اور معتبر تنظیم کے طور پر اردو زبان اور ادب کی خدمت انجام دے گی۔

اس وقت میرے سامنے ''اردو دنیا'' کا جون 2007 کا شمارہ ہے۔ ''آپ کی بات'' کے سلسلے میں بھوپال سے ایک خط ہے جس میں اقبال سے متعلق مراسلہ نگار فرماتے ہیں:

''21 اپریل کو اقبال کا یوم وفات ہے۔ ان کی تصویر یا ان پر کوئی مضمون یا اداریے میں ان کا ذکر ضروری تھا۔ کہیں آپ بھی تو ان کو زندگی بھر پاکستان کی وکالت کرنے والا اور پاکستان جا کر مرنے والا تو نہیں سمجھتے۔'' خط کا یہ حصہ کچھ عجیب و غریب ہے۔ آپ اپنی رائے کو کیوں کسی جریدے پر لادنا چاہتے ہیں؟ اس ضمن میں میں کہنا چاہوں گا کہ ''آپ کی بات'' میں اس طرح کے خطوط اگر شامل نہ کیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ اس طرح کی باتیں تکدر ہی پھیلاتی ہیں۔ اس حصے میں دیگر بہت سے خطوط دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اس شمارے میں ''ہماری بات'' سے لے کر دیگر مشمولات خاص کر ''اچھی اردو''، ''ادب اطفال''، ''اردو شاعروں کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت''، ''مولوی علاء الدین''، ''مولوی لیاقت علی''، ''نشاۃ ثانیہ کی اردو شاعری'' اور ''اردو خبرنامہ'' قابل داد تحریریں ہیں۔ ''اردو دنیا'' اردو جرائد میں ایک منفرد اور معیاری رسالہ ہے۔ جس کا مطالعہ مجھ جیسے معمولی طالب کے لیے بہت ہی کارآمد اور مفید ہے۔ امید کرنی چاہیے کہ اس کو اور نکھارنے میں آپ، جناب مخمور سعیدی اور آپ کے دیگر رفقائے کار مستقبل میں بھی کوشاں رہیں گے۔

■ ماہنامہ ''سبق اردو''، گوپی گنج-221303، بھدوہی (یوپی)

NCPUL میں ڈائرکٹر کے عہدے پر تقرری کے لیے بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ''اردو دنیا'' (مئی 2007) میں آپ کا اجمالی تعارف پڑھا۔ مخمور سعیدی صاحب نے بڑے سلیقے سے آپ کی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر میں ایک لفظ ''فعال'' نے بہت متاثر کیا۔ آج ''اردو'' کو فعال اشخاص کی ہی ضرورت ہے۔

■ ڈاکٹر حیات افتخار، New #80, (Old #213/1)، چولائی میڈو، ہائی روڈ، چولائی میڈو، چنئی-600094

یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا ہے۔ اردو زبان کی موجودہ صورت حال میں آپ جیسی فعال شخصیت ہی اس عظیم عہدے کی ذمے داریوں سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ آپ کے اجمالی تعارف (جو مئی کے شمارے میں مخمور سعیدی نے پیش کیا ہے) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ کی ذات اردو زبان کی خدمت اور ادب کی ترسیل و اشاعت میں ہمیشہ سرگرم اور پیش پیش رہی ہے۔

اردو کے ممتاز شاعر داغ دہلوی نے جس طرح اردو زبان کی مقبولیت کا اظہار یہ کہہ کر کیا تھا کہ ''ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' اسی طرح ساری اردو دنیا میں آپ کے اس رسالے کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر طبقے کی کسوٹی پر یہ رسالہ پورا اتر رہا ہے اور صحیح معنوں میں اردو دنیا کی نمائندگی کر رہا ہے۔ دعا گو ہوں کہ آپ کی قیادت اور ادارت میں یہ رسالہ مقبولیت کی نئی حدوں کو چھونے میں کامیابی حاصل کرے۔

■ اطہر علی احمد علی، اقرا ایجوکیشن سوسائٹی، وور بھ ہاؤسنگ سوسائٹی، گھر نمبر-49، ایوت محل، ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)-445001

اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے میں آپ کو ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے پر دلی مبارک باد دیتا ہوں، قبول فرمائیے۔

''اردو دنیا'' جون 2007 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ''اچھی اردو، روزمرہ، محاورہ، اور صرف'' پڑھنے کا موقع ملا۔ ازراہ کرم آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ اس وقت ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے۔ لوگ اور خاص کر طالب علم، معلم اس سے استفادہ کریں گے۔

■ بابر نقوی الیاسی، 61-B-2/60، سیوک پارک، نجف گڑھ روڈ، اتم نگر، نئی دہلی-110059

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کی صلاحیت اور تجربے سے کونسل کو معراج حاصل ہوگی۔

■ ڈاکٹر نثار راہی، نزد یتیم خانہ، کھانڈا فالسہ، جودھپور-342001

آپ کی قیادت میں ''اردو دنیا'' کو ایک الگ پہچان ملے گی، ایسی ہماری توقع ہے۔ ''اچھی اردو'' کالم کے ذریعے غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے اور

اسی بہانے ہم ایک دوسرے کی اصلاح بھی کرتے رہتے ہیں۔ مختلف ریاستوں میں اردو کی موجودہ صورت حال سے واقفیت بھی مضامین کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے 150 سال پورے ہوئے۔ اس سلسلے میں ''اردو دنیا'' انھیں صحیح معنوں میں خراج عقیدت بھی پیش کر رہا ہے اور ہمارے دلوں میں ان کی یادیں تازہ کر رہا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا انٹرویو تشنہ ہے۔ دوسرے کئی اہم سوالات پر ان سے گفتگو کی جاسکتی تھی۔

■ **صادق علی انصاری ''نشیمن''، 198 اے، شیخ سرائے، سیتاپور، یوپی 261001-**

آپ کا ماہ نامہ ''اردو دنیا'' مطالعے میں رہتا ہے۔ جون 2007 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ اس میں تمام ادبی مواد معیاری ہے۔ ''اردو خبرنامہ'' مجھے بہت پسند ہے۔ پڑھنے سے لگتا ہے کہ میں پروگرام میں شریک ہوں۔

''جانے والوں کی یاد'' کے تحت علی باقر کے انتقال کی خبر پڑھی۔ لوگ اکثر کسی بھی مرنے والے کے لیے کہہ دیا کرتے ہیں کہ مرحوم کی جگہ پُر نہیں ہوسکتی۔ ہاں مجھے یہ ضرور لگا کہ ایک بہت اچھا مصنف ہمارے درمیان نہیں رہا۔ مرحوم ماہ نامہ ''شمع'' اور ''بیسویں صدی'' کے مستقل لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ میں نے انھیں بہت پہلے سے پڑھ رکھا ہے۔

■ **محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، اے پی-503002**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (جولائی 2007) کا 30 جون 2007 کو ساڑھے گیارہ بجے کالج پر حاصل ہوا۔ تازہ شمارے کا انتظار قاری کو بہت بے چین کرتا ہے کیونکہ اس میں مواد تازہ اور نیا ہوتا ہے۔ تازہ شمارہ ملتے ہی مسرت ہوتی ہے ''اردو دنیا'' ظاہری اور باطنی اعتبار سے اتنا حسین اور خوب صورت ہوتا ہے کہ قاری محو ہوکر رہ جائے۔ اس رسالے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صرف ادب بلکہ زبان اور تعلیم، تاریخ و ثقافت، صحافت، شخصیت، انٹرویو، کیریئر، انٹرنیٹ وغیرہ عنوانات کے تحت بڑے فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ''ہماری بات'' کے تحت اداریے زبان و ادب کے مسائل پر فکر انگیز ہوتے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں ''ہماری بات'' میں اردو کی نصابی کتابیں بروقت دستیاب کرانے کا ذکر ہے۔ پتہ نہیں ان مسائل سے اردو کو کب چھٹکارا حاصل ہوگا۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا کالم ''اچھی اردو، روزمرہ، محاورہ، صرف'' بہت معلوماتی ہوتا ہے جس میں موصوف مشکل سے مشکل سوالات کے جوابات دانش ورانہ انداز سے دیتے ہیں۔ لسانی اور ادبی معلومات سے بھرپور اس کالم کو جاری رکھیں۔ یہ کالم ادب کے طالب علموں کے لیے بے حد سودمند ہے۔

ایم آئی ساجد کا مضمون ''پرائمری سطح پر اردو کا نثری نصاب'' بہت معلوماتی ہے۔ ان کی تجاویز پر عملی حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ انگریزی میڈیم کی ابتدائی جماعتوں میں جو طرز تدریس اپنایا جاتا ہے ویسا ہی اردو میں بھی ہو تو معیار بلند شروع ہوسکتا ہے لیکن ہم لوگ روایتی انداز اپناتے ہیں لہٰذا اسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ ایم نسیم اعظمی کا مضمون جس میں عربی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی اداروں کے قیام کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے بہت اہم مضمون ہے۔ اردو کی طرح عربی مدارس میں بھی روایتی انداز سے تعلیم دی جاتی ہے بلکہ وہاں کے اساتذہ غیر تربیت یافتہ بھی ہوتے ہیں۔ ان کو بھی دیگر مضامین کے اساتذہ کی طرح ٹریننگ دی جائے اور ماہر بنایا جائے، یہ ضروری ہے۔ ''بے در و دیوار: سید احمد شمیم کا تازہ کلام'' کا جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے عمیق محاکمہ کیا ہے اور سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انور محمود خالد کا مضمون ''مشاہدات زنداں: مولانا حسرت موہانی کی آپ بیتی'' مختصر ہونے کے باوجود معلومات افزا ہے۔ حسرت نے جیل کی صعوبتیں کس خندہ پیشانی سے برداشت کیں، اس سے ان کی حوصلہ مندی اور آزادی وطن کے لیے تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقتدار عالم خاں کا مضمون ''اردو زبان اور 1857 کی بغاوت'' بھی معلومات افزا ہے۔ فضل الرزاق خاں ارشد نے اپنے مضمون ''جنوں کی حکایات خوں چکاں'' میں 1857 کے ایک مجاہد میر عالم خاں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے آزادی وطن کے لیے اپنی جان قربان کردی۔ مضمون سے یہ اطلاع بھی ملی کہ میر عالم خاں صاحب مضمون نگار فضل الرزاق خاں ارشد اور ''اردو دنیا'' کے اعزازی مدیر مخمور سعیدی کے بزرگوں میں سے تھے۔ پروفیسر ابن کنول نے عرب کے بدوی اور ہندوستان کے دیہی سماج کا تقابلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ آج بھی دیہی سماج میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ افتخار الزماں نے ''قومی یکجہتی اور اردو ذرائع ابلاغ'' میں اردو پرنٹ میڈیا کے اس کردار کو بخوبی نمایاں کیا ہے جو شروع سے قومی یکجہتی، اور ذہنی ہم آہنگی کے فروغ کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔ ''جام جہاں نما'' سے آج تک مشترکہ تہذیبی اقدار کی تعمیر و تشکیل میں اردو ذرائع ابلاغ پیش پیش رہے ہیں۔ ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار اور تعمیری ذہن کو معتبر حوالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے اسد فیض کا مکالمہ بھی خوب ہے۔ اس میں تنقید، تحقیق اور تخلیقی ادب کی موجودہ صورت حال کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کے انٹرویو آئندہ بھی شائع ہوں تو ادب کا قاری فیض حاصل کرے گا۔ رسالے کے دیگر کالم بھی بہت سودمند اور کارآمد ہیں۔ یہ رسالہ اردو والوں کو روایتی ماحول سے نکالنے کا ایک اہم وسیلہ بن گیا ہے، جو ادبی بصیرت کے ساتھ عصری آگہی بھی عطا کرتا ہے۔

■ **شاہدہ تسنیم، مکان نمبر 6-3-659/2، کوپلہ لین، ساجی گوڑا، حیدرآباد-500082**

قومی اردو کونسل کا ماہ نامہ ''اردو دنیا'' ہو یا سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' دونوں ہی پرچے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان پرچوں کے مشمولات نہ صرف عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ نئی نسل کے مضمون نگاروں کے لیے بھی نہایت مفید ہوتے ہیں۔ میں بے حد دلچسپی سے ان پرچوں کا مطالعہ کرتی ہوں۔

□□□

ہماری بات

اس شمارے میں کرشن چندر کا ایک پرانا انٹرویو شائع کیا جارہا ہے جو 1966 میں کلکتے میں کیا گیا تھا اور وہاں کے ایک روزنامے میں شائع بھی ہوا تھا۔ 41 برس بعد اس کی دوبارہ اشاعت کا جواز یہ ہے کہ کرشن چندر نے آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کی صورت حال اور اپنی زبان کے بارے میں اردو والوں کے جس رویے کا ذکر کیا ہے، اس میں اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ کرشن چندر کی مادری زبان اردو نہیں تھی لیکن انھوں نے اپنا فنی وسیلۂ اظہار اس زبان کو بنایا اور اس کے ساتھ انھیں جو والہانہ لگاؤ تھا، اس کا اندازہ بھی اس گفتگو سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے ان الفاظ میں جو درد ہے، اسے بیان تو نہیں محسوس ہی کیا جاسکتا ہے کہ ''اردو کو زندہ رکھنا اور اسے فروغ دینا اب صرف مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ کرشن چندر جس نسل میں پیدا ہوا ہے آئندہ اس نسل میں کرشن چندر پیدا نہیں ہوگا۔'' کرشن چندر کی یہ پیش گوئی پوری طرح تو سچ ثابت نہیں ہوئی، اردو پڑھنے اور لکھنے والے، مسلمانوں کے علاوہ ملک کے دوسرے مذہبی فرقوں میں بھی پیدا ہورہے ہیں اور قرائن بتاتے ہیں کہ آئندہ بھی پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ان کی پیش گوئی میں اتنی سچائی ضرور ہے کہ یہ تناسب بتدریج کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کے ازالے کی کیا صورت ہو، اس پر غور کرنا چاہیے۔

کرشن چندر نے اردو والوں کی ایک اور دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔ اردو والے اپنی زبان کی طرف سے حکومت کی بے توجہی اور سردمہری کی شکایتیں کرتے نہیں تھکتے لیکن اپنی زبان کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے خود ان کی کیا ذمے داریاں ہیں، اس پر غور کرنے کی وہ ضرورت نہیں سمجھتے۔ کرشن چندر نے بالکل درست تجزیہ کیا ہے کہ ''اہل اردو خود ہی پست ہمتی کا شکار ہیں۔ ان پر شدید بے حسی کی کیفیت طاری ہے۔'' آزادی کے چند سال بعد تک اس پست ہمتی کا تو کچھ جواز تھا بھی کہ بااثر اردو دشمن حلقوں نے جن کی رسائی حکومت کے ایوانوں تک بھی تھی، تقسیم ملک کی ذمے داری اردو پر ڈال دی تھی اور اس کے نتیجے میں ایک اردو مخالف فضا ملک کے طول وعرض میں قائم ہوگئی تھی لیکن آہستہ آہستہ ہی سہی، یہ بدگمانی دور ہوتی گئی اور اب اس کے اثرات اگر پوری طرح ختم نہیں ہوئے ہیں تو برائے نام ہی باقی رہ گئے ہیں؛ لیکن اپنی زبان کے تئیں بے حسی کا کوئی جواز تو نہ کل تھا نہ آج ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے عملاً جو کچھ بھی ہورہا ہے، اس کے لیے مالی وسائل صوبائی حکومتیں یا مرکزی حکومت ہی فراہم کررہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ پیسہ ہماری جیبوں سے نکل کر ہی حکومتوں کے ہاتھوں تک پہنچتا ہے، دوسروں کی طرح اردو والے بھی وہ تمام ٹیکس ادا کرتے ہیں جو حکومتیں اپنے شہریوں پر لگاتی ہیں لیکن جس طرح محض ٹیکس ادا کردینے کے بعد ہم اپنے دوسرے تمام معاملات سے غافل نہیں ہوجاتے اسی طرح ہمیں ان ذمے داریوں کا بھی احساس ہونا چاہیے جو اپنی زبان کے تئیں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ حکومتیں اردو میڈیم اسکول قائم کراسکتی ہیں، اسکولوں میں اردو بہ طور مضمون پڑھانے کی سہولتیں فراہم کراسکتی ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو شعبے کھلواسکتی ہیں لیکن ان سہولتوں سے استفادے کی توفیق اگر ہمیں نہیں، تو یہ سب سہولتیں بیکار ہیں۔

اردو والوں کے ذہنوں میں ایک غلط خیال یہ جاگزیں ہوگیا ہے کہ اگر ان کے بچے اردو پڑھیں گے تو دوسرے بچوں سے پچھڑ جائیں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اردو سے اپنی وابستگی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ محض واہمہ ہے۔ بچے کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے اس کی مادری زبان کا ماحول فراہم کیا جائے اور اس کا پہلا ذریعۂ تعلیم اس کی مادری زبان ہو جو ماں کی گود ہی سے اس کے کانوں میں پڑتی رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوسری زبانیں نہ پڑھے۔ ہندی کے ساتھ اپنی علاقائی زبان اور انگریزی بھی ضرور پڑھے کہ اسے ایک عالمی زبان کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے لیکن اپنی مادری زبان سے دست برداری کا کوئی جواز نہیں۔ اسی شمارے میں ہم جناب خالد سعید کا مضمون بھی شائع کررہے ہیں جس میں یہی سوال زیر بحث آیا ہے۔

کرشن چندر نے ایک سوال کے جواب میں اردو ادیبوں کی مفلوک الحالی پر بھی دلچسپ انداز میں اظہار خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ مفلوک الحالی صرف اردو کے ادیبوں یا دوسرے ہندوستانی ادیبوں کا ہی مقدر نہیں ہے، دوسرے ممالک میں بھی جنھیں ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انھوں نے انگلستان کی ایک ادب نواز دولت مند خاتون کا ذکر کیا ہے جو ایک شاندار ہوٹل کی مالک تھی جہاں مفلس ادیبوں اور شاعروں کو مفت کھانا ملتا تھا۔ ہمارے یہاں اتنی فراخ دلی تو شاید ہی کسی ریستوران کے مالک کا وتیرہ رہی ہو لیکن چھوٹے بڑے تمام شہروں میں ایسے چائے خانے ضرور موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں جہاں ایک دو میزیں شاعروں اور ادیبوں کے لیے وقف رہا کرتی ہیں اور ان پر بیٹھنے والوں سے بیرا آکر آرڈر کے لیے نہیں کہتا، وہ خود

ہی چاہیں تو کچھ طلب کرلیں اور ان کی طلب صرف چائے ہوتی ہے، دیگر لوازمات قطعاً نہیں۔ بعض وضعدار صبح آکر بیٹھتے ہیں تو رات ہی کو اٹھتے ہیں جب ریستوران بند ہونے والا ہو۔ دوسرے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں جن میں ان کے شناسا بھی ہوتے ہیں جو انھیں چائے پلوانا اپنے لیے خیر و برکت کا موجب خیال کرتے ہیں۔

زبان و ادب کے معاملات دراصل ان معاملات سے مختلف ہیں جنھیں ہم کاروباری معاملات سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ کاروباری معاملات، خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، سود و زیاں کے تابع ہوتے ہیں اور نفع و ضرر کے پیمانوں سے ناپے جاتے ہیں لیکن زبان و ادب کا معاملہ مختلف ہے، یہ معاملہ وہ ہے جسے کرشن چندر نے ''والہانہ عشق'' کا نام دیا ہے۔ غالب کے ہمعصر اور مہربان دوست مفتی صدرالدین آزردہ کا ایک شعر یاد آتا ہے:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

□□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپئے مجلد، 336 روپئے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپئے مجلد، 410 روپئے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کرلینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: صرف کی چند امثال دیں اور نحو کی تعریف اور اس کی مثالیں دیں۔

جواب: آپ نے ایک کی جگہ دو سوال کر دیے، بہر حال جواب حاضر ہے۔
علم صرف کا دائرہ عموماً ایک لفظ، یا کسی لفظ کی انفرادی حیثیت سے ہوتا ہے۔ مثلاً یہ سوال علم صرف کے عالم سے ہے کہ عشق، محبت، انس، لگاؤ، پریم، میں کون سا لفظ بہتر ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہ ہے کہ بہتر/مناسب/نامناسب کا تصفیہ محل استعمال کا محتاج ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ''دودھ پیتے بچے کو بھی ماں سے عشق ہوتا ہے''، تو یہ صرف نامناسب کہلائے گا۔ ''دودھ پیتے بچے کو بھی ماں سے محبت ہوتی ہے'' صحیح صرف کہلائے گا۔ علم نحو کا دائرہ انفرادی لفظ نہیں بلکہ پورا جملہ ہوتا ہے۔ اس میں یہ دیکھتے ہیں کہ کسی جملے کے الفاظ کیا کام کر رہے ہیں (فاعل، مفعول، صفت، ترکیب اضافی، ترکیب توصیفی، وغیرہ) اور اس کے مصادر کی نوعیت کیا ہے (ماضی، حال، مستقبل)، اور اس کے مصادر کی گردان کیا ہے (آنا، آیا، آئے گا، آئے، وغیرہ)، جملے میں مبتدا [یا مسند الیہ] کیا ہے اور خبر [یا مسند] کیا ہے، جملے میں الفاظ کس ترتیب سے لائے گئے ہیں (فاعل پہلے ہے یا مفعول پہلے ہے، فعل کی جگہ کہاں ہے، وغیرہ)۔ جب کسی جملے کے الفاظ کی انفرادی حیثیت سے جملے کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس جملے کو ترکیب صرفی کہتے ہیں اور جب کسی جملے کے الفاظ کے آپسی ربط کے اعتبار سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو اسے جملے کی ترکیب نحوی کہتے ہیں۔

سوال:
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اس میں ''راہ میں ہیں'' ہونا چاہیے تھا۔ آپ کے شمارے بابت ماہ مارچ میں ''راہ میں ہے'' لکھا گیا ہے۔ صحیح شعر سے مطلع کریں۔

جواب: یہ شعر آتش کا ہے اور انھوں نے ''راہ میں ہے'' ہی لکھا تھا۔ غزل کا مطلع ہے۔

ہوائے موج مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

یہی بات، کہ یہ شعر آتش کا ہے، اس محاورے کی درستی کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ لیکن تفصیل اس کی یہ ہے کہ تعداد کی کثرت اور شدت اور عمومیت ظاہر کرنے کے لیے واحد فعل لا سکتے ہیں، در حالے کہ وہاں محل فعل جمع کا ہوتا ہے۔
میلے میں کوئی دس لاکھ آدمی رہا ہوگا۔ (یعنی ہر طرح کے لوگ، عورتیں، بچے، مرد، لیکن جانور نہیں، جن کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ رہی ہوگی۔) ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔ (یعنی طرح طرح کے بہت سے پیڑ، کسی ایک طرح کے درخت کی شرط نہیں۔ لمبی جھاڑیاں بھی ہو سکتی ہیں، لیکن کھجور یا تاڑ کا پیڑ نہیں۔)

(سوالات از: کے.اے.زرتار، باگل کوٹ-587101)

سوال: سوال یہ ہے کہ حروف تہجی کی ترتیب تخلیق کیا ہے؟ تمام حرف ایک ساتھ ہی عالم وجود میں لائے گئے یا انھیں وقتاً فوقتاً وضع کیا جاتا رہا؟ مثلاً جب الف کو اس کی آواز دی گئی۔ یقیناً اس وقت ل اور ف حروف نہ صرف عالم وجود میں آ چکے تھے بلکہ انھیں آواز بھی دی جا چکی تھی۔ اسی طرح دیگر حروف کو بھی قیاس کر لیا جائے۔

جواب: آپ کا سوال میرے موضوع سے بالکل خارج ہے۔ بہر حال مختصر جواب عرض کرتا ہوں۔ حرف الف کے نام میں ل اور ف کی آوازوں کا ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ جب الف کو نام دیا گیا تو اس وقت ل اور ف وجود میں آ چکے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ ل اور ف کی آواز موجود رہی ہو لیکن یہ حرف اس وقت نہ بنے ہوں جب الف بنا۔ اردو، فارسی، عربی، عبرانی کا پہلا حرف الف ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سب سے پہلا حرف جسے نام دیا گیا وہ الف تھا۔ یونانی کا پہلا حرف alpha (الفا) ہے اور اغلب ہے کہ یونانی سے قدیم تر انڈو یورپی زبانوں کا بھی پہلا حرف کچھ اسی طرح کا رہا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ الف/الیف/الفا سب سے پہلے نہیں، بلکہ کسی اور وقت میں ایجاد ہوئے۔ مختلف زبانوں میں حروف تہجی کی ترتیب مختلف ہے، اور بعض زبانوں (مثلاً چینی اور لکھائی کی ایجاد کے پہلے کی تمام زبانوں) میں حروف تہجی ہی نہیں ہیں۔ خود عربی کے حروف تہجی عبرانی پر مبنی ہیں لیکن ان کی ترتیب عبرانی میں کچھ ہے، عربی میں کچھ ہے۔ لہٰذا ہر زبان والوں نے اپنے اپنے طور پر حروف تہجی کی ترتیب مقرر کی۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ حروف تہجی کو بولی ہوئی زبان کے اعتبار سے وضع کیا گیا۔ مثلاً لاطینی میں چ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی حرف نہیں۔ انگریزی نے لاطینی کے حروف لیے تو چ کو ادا کرنے کے حسب ضرورت صورتیں بنالی گئیں۔ لکھنا بہت بعد میں شروع ہوا، یعنی انسان نے بولنا ایجاد کرنے کے بہت بعد میں لکھنا ایجاد کیا، اور اس کے بھی کئی مراتب ہیں۔ سب سے پہلے حروف تہجی غالباً فنیقیوں نے وضع کیے۔

سوال: اردو میں مستعمل مشہور محاورہ ''عید کا چاند ہونا'' کے معنی ''بہت دنوں بعد ملنا'' کس حد تک صحیح ہیں؟ راقم کے نزدیک یہ بعید قیاس وعقل ہے کیوں کہ عید کا چاند بھی اتنے ہی دنوں بعد نظر آتا ہے جتنے دیگر اور مہینوں کا۔ میرے خیال میں اس محاورے کے معنی ''بہت تلاش و تجسس کے بعد نظر آنا'' ہونا چاہیے۔

جواب: آپ نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے لیا کہ ''عید کا چاند ہوجانا'' کے معنی ''بہت دنوں کے بعد ملنا'' بعید از قیاس وعقل ہیں۔ بے شک ایسا ہی ہے۔ لیکن زبان میں قیاس نہیں چلتا۔ زبان کی بنیاد استعمال عام پر ہے۔ داغ کا شعر ہے۔

کب سے شب فراق ہوں مشتاق دید کا
خورشید ہوگیا ہے مجھے چاند عید کا

اگر آپ قیاس لگانا ہی چاہیں تو یوں لگائیے: لوگوں کو عید کے چاند کا اشتیاق رہتا ہے۔ لہٰذا ''عید کا چاند'' کے معنی ہوئے وہ جس کا اشتیاق ہو لیکن جو سال میں ایک ہی بار (یعنی بہت کم) دکھائی دے۔ بہادر شاہ ظفر۔

کبھی دکھاتا ہے صورت ہمیں برسویں دن
غرض وہ مہر لقا چاند عید کا ٹھہرا

لہٰذا ''عید کا چاند ہونا'' کے معنی ہوئے ''بہت کم نظر آنا''۔ امید ہے اب بات صاف ہوگئی ہوگی۔

سوال: حرف ب اور اس قبیل کے دوسرے حروف کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ اسے کچھ لوگ ''با'' پڑھتے ہیں، کچھ لوگ ''بے'' پڑھتے ہیں۔

جواب: اردو کے تلفظ حسب ذیل ہیں: الف، بے، پے، تے، ٹے، ثے، جیم، چے، [بڑی] حے، خے، دال، ڈال، ذال، رے، ڑے، زے، ژے، سین، شین، صاد یا صواد، ضاد، طا یا طوے، ظا یا ظوے، عین، غین، فے، قاف، کاف، گاف، لام، میم، نون، واؤ، ہے، ہمزہ، یے، بڑی یے۔ فارسی میں ٹ، ڈ، ڑ نہیں ہیں اور وہاں ہمزہ کو حرف نہیں قرار دیتے ہیں، بلکہ فارسی میں آج کا رجحان تو حتی الامکان ہمزہ کو ترک کرنے کا ہے۔

ہم لوگ جہاں بڑی ے بولتے ہیں وہاں فارسی عربی میں الف بولا جاتا ہے: با، [پا]، تا، ثا، حا، خا، را، زا، [ژا]، فا، ہا، یا۔ عربی میں پ اور ژ نہیں ہیں لیکن فارسی والے ان کا تلفظ اس طرح کرتے ہیں جس طرح عربی میں کیا جاتا اگر یہ حروف عربی میں ہوتے۔ عربی میں چ اور گ نہیں ہیں۔ فارسی میں انھیں جیم فارسی اور کاف فارسی کہا جاتا ہے۔

سوال: ہمزہ حرکت ہے یا حرف؟ اردو کے اکثر علما نے اس کو حروف تہجی میں شمار کیا ہے۔ فن عروض میں بھی ہمزہ کو حرف مانتے ہیں۔

جواب: اس پر پہلے بھی کلام ہو چکا ہے۔ اردو کے لیے ہمزہ حرف ہے۔

(سوالات از: رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی، میاں سرائے، سنبھل-244302)

سوال: یوں تو اردو دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے مگر اس کے ہندسے اب تک بائیں سے دائیں لکھے جاتے رہے ہیں۔ مگر اب دیکھنے میں آرہا ہے کہ ہندسے بھی دائیں سے بائیں لکھے جارہے ہیں جیسے ۹۷۹۱ بجاے ۱۹۷۹۔ صحیح کیا ہے؟

جواب: اردو میں گنتیاں اب بھی بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہیں۔ اگر کہیں دائیں سے بائیں لکھا ہوا دیکھیں تو اسے کمپیوٹر پروگرام کی مہربانی خیال کریں۔

سوال: جاہلیت اور جہالت، استاد اور استاذ، الکوہل اور الکوحل، ان میں کون سا درست ہے؟ اگر یہ الگ الگ لفظ ہیں تو کیا معنی میں بھی کوئی فرق ہے؟

جواب: جاہلیت ایک اصطلاح ہے۔ اس سے عرب میں قبل ظہور اسلام و رسول اسلام کا زمانہ مراد ہے۔ جہالت (عربی میں اول مفتوح، اردو میں عام طور پر اول مکسور بولتے ہیں) کے معنی ہیں: ناواقفیت، لہٰذا جاہل ہونے کی کیفیت۔ اردو میں ایک معنی اور تھے: ضدی پن، اڑیل پن۔ اب یہ معنی بہت شاذ ہیں۔ استاد اور استاذ دونوں صحیح ہیں۔ فارسی میں استاذ (مع ذال) زیادہ مستعمل ہے، اردو میں استاد (مع دال)۔ لیکن اردو میں کئی استعمالات ایسے ہیں جہاں استاذ خلاف محاورہ، بلکہ غلط ہے۔ مثلاً موسیقی کے ماہر کو ہمیشہ استاد کہتے ہیں، استاذ نہیں۔ کسی بھی فن میں ماہر شخص کو بھی استاد کہتے ہیں، استاذ نہیں۔ مصحفی کا مصرع ہے:

تم کام میں اپنے غرض استاد ہو کوئی

اسی طرح، کسی کو بے تکلفی سے مخاطب کریں تو اس موقعے پر بھی استاد ہی کہیں گے۔ داغ کا مصرع ہے:

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

علی ہذا القیاس، استادی کا ہاتھ، کسی کی استادی، وغیرہ میں استاذ کہنا خلاف محاورہ ہے۔ فارسی اور اردو میں استاذ کی جمع عربی قاعدے سے

بنالی گئی ہے، اساتذہ۔ جدید فارسی میں استاد کی بھی جمع عربی قاعدے سے بن گئی ہے، اساتید۔ اساتید اردو میں بالکل مستعمل نہیں۔

سوال: الکوہل یا الکحل میں کون سا لفظ درست ہے اور کیا معنی میں بھی کوئی فرق ہے؟

جواب: انگریزی لفظ Alcohol ہر اس محلول کو کہتے ہیں جسے آگ پر ڈالیں تو بھڑک اٹھے۔ یہ دراصل عربی لفظ الکحل ہے، کیونکہ عربوں نے سب سے پہلے یہ بات دریافت کی تھی کہ سیسہ (جس کا سائنسی نام Antimony ہے) اور جس سے سرمہ (عربی میں الکحل) بنتا ہے، اسے کشید کر کے اس کا رسوب Precipitate نکالیں تو وہ رقیق ہوتا ہے لیکن آگ پر ڈالنے سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس رسوب کو بھی عربوں نے الکحل کہا۔ انگریزی اور دوسری زبانوں نے اس لفظ کو عربی سے لے لیا اور اپنے اپنے تلفظ میں، لیکن اصل ہی معنی میں، استعمال کیا۔

اردو میں الکحل (بروزن فاعلن) لکھنا بہتر ہے۔ لیکن بعض لوگ انگریزی کی نقل میں الکوہل بھی لکھتے ہیں اور اس کا تلفظ بروزن فاعلن یا مفعولن کرتے ہیں۔ میں الکحل کو ترجیح دیتا ہوں۔

(سوالات از: محمد یعقوب فاروقی، نصیر آباد، گورکھ پور)

سوال: خلا کی جمع خلاؤں کہاں تک درست ہے؟

جواب: خلا بمعنی Space نیا لفظ ہے اور اس کی جمع خلاؤں رائج ہے۔ مجھے اس میں کوئی قباحت نہیں نظر آتی۔

سوال: بہت سے بزرگ ادبا بعض الفاظ کی جمع الجمع استعمال کرتے رہے ہیں: وجوہات؛ اکابرین؛ رسومات؛ مشائخین۔ جمع الجمع استعمال کرنا غلط ہے یا درست؟

جواب: جمع الجمع کا استعمال اردو میں بہت پرانا ہے۔ پہلے تو ''عنایاتیں'' جیسی جمع الجمع بھی مستعمل تھی، اب صرف عربی طرز کی جمع الجمع دکھائی دیتی ہے۔ نحوی حضرات عموماً ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ جمع الجمع غیر ضروری ہے۔ لیکن اردو میں بعض الفاظ کی جمع الجمع زور کلام، یا حسن کلام کے لیے مستعمل رہی ہے، لہٰذا اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ یہ کہاں استعمال ہو اور کہاں تک استعمال ہو، یہ معاملہ لکھنے/بولنے والے کے ذوق سلیم پر منحصر ہے۔

سوال: ہماری شاعری میں مثلاً متاع ایمان، رنگ گلستان، خاک ہندوستان، جیسی تراکیب ملتی ہیں، یعنی ان میں اعلان نون کیا گیا ہے۔ بعض عروضی اور اساتذہ اسے غلط قرار دیتے ہیں۔ معترض حضرات کی بات کہاں تک قابل قبول ہے؟

جواب: یہ سوال عروض کے عالم سے ہے اور یہاں اس کا محل نہیں۔ خیر، جواب حاضر کرتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس موضوع پر میں بہت تفصیل سے کلام کر چکا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ پرانی اردو میں اعلان نون پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی، یہ پابندی بہت بعد کے لوگوں نے، اور اغلب یہ ہے کہ لکھنوی شعرا نے عائد کی۔ تیسری بات یہ کہ اصولی طور پر فارسی عربی الفاظ میں اعلان نون بالکل درست ہے، خواہ وہ مع عطف و اضافت ہو یا بدون عطف و اضافت ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے پڑھے لکھوں کی بول چال میں اعلان نون یا اخفائے نون دونوں طرح موجود ہے اور کسی قدیم کتاب میں اس کے خلاف مذکور نہیں۔ لیکن عملی بات یہ ہے کہ آج کے شعرا عام طور پر اعلان نون مع عطف و اضافت کو غلط نہیں سمجھتے اور میں بھی ان کا ہم خیال ہوں۔ بعض لوگ اعلان نون مع عطف و اضافت سے اس لیے پرہیز کرتے ہیں کہ لوگ انھیں جاہل نہ سمجھیں۔

(سوالات از: محمد شاہد پٹھان، راجستھان یونیورسٹی کیمپس، جے پور)

سوال: شعرائے کرام کے تخلص پر جونشان (ـــ) اس شکل میں لگا ہوتا ہے، مثلاً میر، غالب وغیرہ، ان کے تخلص پر لگا ہوا نشان کیا کہلاتا ہے؟

جواب: جس نشان کا آپ نے ذکر کیا ہے یعنی (ـــ) اسے بَت کہتے ہیں (اول مفتوح)۔ یہ دراصل بابت کا مخفف ہے۔ بابت کے معنی کئی ہیں۔ ان میں سے ایک معنی ہیں حساب، یا حساب پر لگانے کا نشان، جسے مد حساب بھی کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ جب کوئی فہرست بناتے تھے، یا کئی حساب ایک ساتھ لکھتے تھے تو فہرست میں شامل ہر نئی چیز پر یہ نشان بنا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح، جہاں نیا حساب شروع کرتے تھے اس پر بھی یہ نشان بنا دیا کرتے تھے جیسا کہ غالب کے شعر میں بھی ہے۔

خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بے کاری گذشت
رشتۂ عمر خضر مد حسابے بیش نیست

پہلے زمانے میں شاعر یا مصنف کے تخلص پر یہ نشان یعنی بت لگانے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ تخلص کو ممتاز کرنے کے لیے کبھی کبھی اسے جلی کر دیتے تھے جیسے کسی نمایاں رنگ یا سرخی سے لکھتے تھے۔ تخلص پر بت لگانے کا رواج کب شروع ہوا اس کے بارے میں میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ذاتی طور پر میں تخلص پر نشان لگانے کے حق میں نہیں ہوں۔ بہرحال اس نشان کا نام بت ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اسے عربی لفظ بَتّ یعنی ''کٹا ہوا'' بھی بتایا ہے، لیکن اس کی کوئی اصل نہیں۔

(سوال از: فہیم خاں، شیخ سرائے، سیتاپور-261001) □□□

خالد سعید

اردو: مضمون کہ ذریعۂ تعلیم

روزنامہ ''منصف'' مورخہ 7 جون کے شمارے میں جناب فیروز بخت کا ایک مضمون، جو غالباً ان کی کتاب ''اردو تعلیم اور اسکول'' سے لیا گیا ہے، نیوز آئٹم کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے اعداد وشمار کی بنیاد پر اردو تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اسکولوں میں اردو کو بحیثیت ایک مضمون اختیار کیا جانا چاہیے نہ کہ ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے۔ دوسری طرف چند دن پہلے اسی اخبار میں، مورخہ 2 جون، ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی جو ہندوستانی نژاد کینیڈا کی نئی نسل میں ہندی کی مقبولیت سے متعلق تھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ کینیڈا کی یہ نوخیز نسل اپنے بزرگوں، اپنے عمر رسیدہ رشتہ داروں سے، جو انگریزی زبان سے واقف نہیں، بات چیت کرنے اور ان سے تعلق قائم رکھنے کے لیے، ہندی سیکھنے کے مشتاق و متمنی ہے۔ وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے، ہندی سیکھنے کے لیے بالی وڈ کی فلمیں دیکھنے لگی ہے۔ وہاں کی فلاحی اور ہندو مذہبی تنظیمیں اسے ہندی سکھانے کا انتظام کر چکی ہیں۔ ان دونوں خبروں کا حوالہ دینے کا مقصد دو مختلف لسانی گروہوں کے مزاج وعمل کی نشاندہی کرنا ہے۔ ایک طرف ہم اردو والے ہیں، جن کی نظر ہمیشہ اپنی زبان کے تاریک پہلوؤں پر پڑتی ہے اور دوسری طرف ہندی والے ہیں جو ہندی کی صورت حال کو مزید بہتر بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

بات یہ ہے کہ اردو میں تعلیم کی جب بھی بات آتی ہے، ہم میں سے اکثر اردو میں تعلیم کے دو مختلف پہلوؤں کو گڈمڈ کر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے نتیجہ مبہم اور مایوس کن نکلے گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اردو میں تعلیم کا مطلب ہے:

1. اردو زبان و ادب کی تعلیم...... ابتدائی و اعلیٰ سطحوں پر۔
2. تعلیم بذریعۂ اردو...... یعنی دیگر علوم و مضامین کی تعلیم بذریعۂ زبان اردو۔۔ ابتدائی و اعلیٰ سطحوں پر۔

اگر چہ دونوں طرح کی تعلیم کے مقاصد، رسائی اور نتائج بالکلیہ جدا ہیں۔ لہٰذا ان کے مسائل کی نوعیت بھی جداگانہ ہوگی اور حل بھی۔ ان پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں اس فرق کا دھیان رکھنا چاہیے۔ ان دونوں معاملوں میں کچھ چیزیں مشترک بھی ہیں، وہ ہیں اردو والوں کی مرعوبیت، قوت ارادی کا فقدان، غیر واضح تصور تعلیم اور بے رغبتی، یہ عناصر ایک عام اردو بولنے والے سے لے کر اردو سے وابستہ اعلیٰ ترین عہدیداروں تک مشترک ہیں۔ مثلاً فیروز بخت صاحب نے صاف طور سے کہہ دیا ہے کہ اردو کو ایک زبان کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے، ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے نہیں۔ اور اسے آئی.سی.ایس.ای. کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ان کے خیال میں اس طرح کی حکمت عملی اختیار کرنے سے ایک تو اردو کے بچے ان مسائل کا شکار نہ ہوں گے جنھیں وہ جھیل رہے ہیں اور ان کی تعلیمی حالت بھی سدھر جائے گی۔ دوسری طرف ICSE کے نصاب میں اردو کے شامل ہونے سے دوسرے یعنی غیر اردو داں طلبہ بھی اسے ایک زبان کے طور پر اختیار کریں گے اور اس طرح اردو جاننے والوں کا دائرہ وسیع ہوگا۔ ان کی اس بہترین تجویز کو پڑھنے کے ساتھ ہی کچھ سوالات ذہن میں در آتے ہیں:

1. کیا کوئی لسانی گروہ اپنی زبان کو صرف شعر و ادب کی زبان تک محدود رکھنا چاہے گا یا اسے ایک علمی زبان کے طور پر دیکھنا پسند کرے گا؟
2. کیا کوئی زبان محض شعر و ادب کی زبان بن کر سماج میں وہ وقار و مرتبہ حاصل کر سکتی ہے جو ایک علمی زبان کو حاصل ہوا کرتا ہے؟
3. کیا کوئی اور زبان بحیثیت ذریعۂ تعلیم مادری زبان/ زبان اول سے بہتر ہوسکتی ہے؟
4. کیا غیر مادری زبان یعنی زبان دوم میں Conceptual Education موثر اور کامیاب ہوسکتی ہے؟
5. غیر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر کیا بچے کی جذباتی زندگی کی بھی تشفی ہوسکتی ہے؟ اور کیا اپنی مادری زبان سے اس کی انسیت باقی رہ سکتی ہے؟

جناب فیروز بخت کی تجویز ''اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنے'' کا مطلب یہ ہوا کہ اردو کو محض ایک زبان کی حیثیت سے پڑھا جائے۔ جس طرح ہمارے بچے اسکولوں میں ہندی، تلگو، انگریزی، مراٹھی وغیرہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کا ایک مطلب اردو کو محض شعر و ادب کی زبان تک محدود کر دینا، یعنی اسے ایک علمی زبان نہ سمجھنا ہے۔ جب کہ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی باشعور لسانی گروہ اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ اس کی زبان بول چال تک یا شعر و ادب کے اظہار تک محدود ہو کے رہ جائے۔ غالباً خود فیروز بخت بھی دل سے یہ نہ چاہتے ہوں گے۔ وہ بھی اس حقیقت کو مانتے ہوں گے کہ جو وقار و مرتبہ کسی علمی زبان کو حاصل رہتا ہے وہ کسی غیر علمی زبان کو نہیں ملتا۔ اور علمی زبانیں صرف علم کی ترویج کا ذریعہ ہی نہیں ہوتیں بلکہ ان کے توسط سے روٹی روزگار کے حصول

میں بھی مدد ملتی ہے۔لہٰذا زبان کو علم کی ترویج کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے۔یعنی علمی زبان ہونا چاہیے۔

کسی زبان میں علم کی ترویج تو اسی وقت ممکن ہے، جب اس زبان کے بولنے والوں میں علم کو جذب کرنے کی صلاحیت ہو۔زبان کے حوالے سے وہ علم اور علمی تصورات کا ادراک کرسکتے ہیں۔اگر پہلے خود پر علمی تصورات واضح نہ ہوئے ہوں، ان کی تفہیم نہ ہوئی ہو تو پھر وہ کس طرح علم کی ترویج کرسکیں گے۔ جہاں تک علمی تصورات کے ادراک و تفہیم کا معاملہ ہے، یہ عمل لڑکپن سے تا حیات جاری رہتا ہے۔البتہ لڑکپن میں علمی تصورات جتنے واضح ہوں گے، اتنی ہی ان کی تفہیم موثر ہوگی۔علمی تصورات کو جذب کرنے کی صلاحیت بچپن میں جتنی زیادہ ہوگی، آگے چل کر، شخصیت کی تعمیر میں اتنی ہی ممد و معاون ہوگی۔اسی لیے دنیا کے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم بچے کی مادری زبان/زبان اول میں ہونی چاہیے۔غیر مادری زبان Conceptual Education کے معاملے میں اتنی سودمند ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ مادری زبان۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا کے سارے ماہرین تعلیم کے خلاف عمل کرتے ہوئے اپنے بچوں کو ان مدارس میں، جن کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان نہیں ہوتا، بڑے شوق سے شریک کراتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہ تو جناب فیروز بخت نے بتلا دیں۔لیکن وہ ساری وجوہ ظاہری ہیں۔داخلی سبب تو یہ ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم سے متعلق ہمارے تصورات صاف نہیں ہیں اور ہم مرعوبیت کا شکار ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کتابوں میں درج علم ہی علم ہے اور وہی علم علم ہے جو ہمیں روزی روٹی مہیا کرسکتا ہے۔لہٰذا کتابیں جتنی اچھی، چمکیلی اور دیدہ زیب ہوں گی، اتنی ہی طالب علم کے لیے سودمند ہوں گی۔ ان مدرسوں میں جن میں یہ بھاری بھاری کتابیں فراہم کی جاتی ہیں، اور اس زبان میں، جس میں یہ بھاری بھاری کتابیں دستیاب ہیں، پڑھائیں تو آگے چل کر روزی روٹی کے اتنے ہی مواقع میسر آسکتے ہیں۔ بچے کو کرنا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر ان کتابوں کو پی لے۔ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ابتدائی جماعتوں اور خصوصاً ثانوی جماعتوں میں علم کے ادراک و تفہیم کے معاملے میں بچے کی فطرت الگ ہوتی ہے:

''بچپن میں جب فطرت بچے کو اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب گرد و پیش کی چیزوں کو برت کر، بنا کر، بگاڑ کر، توڑ کر جوڑ کر سمجھنے اور ان سے تعلقات قائم کرنے پر طبیعت دم بہ دم اکساتی ہے۔ جب وہ اپنے حواس کی مشق چاہتا ہے۔یعنی جس عمر میں بچوں کی بڑی اکثریت کا رجحان طبع عمل اور تجربے کی طرف ہوتا ہے، اس عمر میں ان کو صرف کتابیں دے کر تنگ و تاریک مکانوں میں قیدیوں کی طرح نہ بٹھائیں۔''

(ذاکر حسین۔''مسلمانوں کی ثانوی تعلیم''، مشمولہ تعلیمی خطبات۔مکتبہ جامعہ دہلی۔ستمبر 1988۔ص،38-37)

ذاکر صاحب کا یہ مشورہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں سے متعلق ہے کہ بچوں کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر محض قیدی نہ بنائیں جب کہ مادری زبان میں لکھی گئی کتابیں بچے کو کچھ نہ کچھ سمجھ میں آتی ہیں۔ایک ہم ہیں کہ زبان غیر میں بچے کو تعلیم دلا کر اسے قیدی بنانے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ذاکر صاحب کے مطابق ثانوی تعلیم کا مقصد اشیا سے، تصورات سے عملاً تعلقات قائم کرنا ہے۔اپنے حواس کی مدد سے تصورات کو جذب کرنا ہے۔تجربات سے گزر کر علم کو محسوس کرنا ہے اور اس عمل میں جتنی مادری زبان معاون اور کارگر ہوسکتی ہے، کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے املی کی کھٹاس، شہد کی مٹھاس، پھٹکری کی کسیلی ترشی تبسم کی تراوٹ، تارے کی جھلملاہٹ، ہونٹوں کی نمی، کلیوں کی مہک، چڑیوں کی چہک اور پھول کی ملائمت کو اشیا اور حواس کے ذریعے ہی سے نہیں، اپنی مادری زبان اردو کے حوالے سے اپنی روح میں جذب کیا ہے۔خیر کی صداقت، شر کی شرارت، نیکی کی معنویت، وفاداری کی قیمت اور محنت کی عظمت کا ادراک محض تجربات ہی کے ذریعے سے نہیں اردو کہانیوں کے ذریعے سے حاصل ہوا تھا۔فرض کیجیے میں بچپن میں اپنی مادری زبان کی بجائے کسی دوسری زبان میں تعلیم حاصل کرتا ہوتا اور تب پھٹکری چکھتا، اس کا کسیلا ترش پن زبان محسوس تو کرتی، لیکن زبان دیگر میں ادھوری رسائی کے سبب میری فرہنگ Vocabulary محدود ہوتی اور میں اس ذائقے کو بیان نہ کرپاتا۔بات یہ ہے کہ ایک بچے کے لیے دیگر زبان کی فرہنگ پر دسترس، اپنی مادری زبان کی فرہنگ کے مقابلے میں کم ہی ہوا کرتی ہے۔ وہ اس لیے کہ مادری زبان/زبان اول میں روزانہ بات چیت کرتے ہوئے، سنتے سناتے ہوئے، سیکڑوں الفاظ بچے کے علم میں آتے جاتے ہیں۔ اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان الفاظ کے واسطے سے کوئی تجربہ، کوئی تصور یا کوئی احساس کب اس کی روح و ذہن میں جذب ہوچکا ہے اور اس کے علم میں اضافے کا سبب بنا ہے۔یہ فطری تعلیم ہے۔ جب کہ زبان دوم کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوتا۔لہٰذا ایسے بچے جن کے گھروں اور اطراف و اکناف میں بولی جانے والی زبان اور اسکول کی زبان میں فرق پایا جاتا ہو، یعنی دونوں دو علاحدہ زبانیں ہوں تو لامحالہ ان طلبہ کی فرہنگ محدود ہوتی ہے۔ انھیں لفظوں کی قلت پیش آتی ہے۔لغت کی قلت کا مطلب محض الفاظ کی کمی نہیں، بلکہ تصورات کے ادراک سے محرومی، تجربات کے اظہار پر عدم دسترس بھی ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا بچوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم ان کی مادری زبان/ زبان اول ہی میں ہونی چاہیے۔تاکہ علمی تصورات محض اکتساب بن کر نہ رہ جائیں۔علم ان کے رگ و ریشے میں اس طرح جذب ہوجائے جس طرح کلیوں میں، شگوفوں میں بادِ صبح گاہی کا نم۔

بعض حضرات اس بات کے تو قائل ہیں کہ اسکول کی سطح تک بچے کی تعلیم

مادری زبان اردو میں ہونی چاہیے لیکن وہ اس بات کے قائل نہیں کہ اعلیٰ تعلیم بھی اردو میں فراہم کی جائے۔ ان کے نزدیک اول تو یہ ممکن نہیں، دوم طلبہ کے لیے سودمند اور افادیت کی حامل بھی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ فشارِ علم کے دور میں اردو کا دامن اتنا وسیع نہیں کہ لحظہ لحظہ بدلتے اور بڑھتے ہوئے علوم کو اس میں سمیٹا جا سکے۔ نہ تو ان علوم کی اصطلاحیں اردو میں ترجمہ کی جا سکتی ہیں اور نہ علوم کو اس زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اردو والوں میں ایسی شخصیتیں دستیاب نہیں۔ اگر یہ مان لیں کہ کچھ لوگ اردو زبان پر دسترس رکھتے تو ہیں، لیکن انھیں دوسرے علوم اور دوسری زبانوں پر دسترس حاصل نہیں اور وہ اردو والے جو کسی علمی مضمون پر دسترس تو رکھتے ہیں، لیکن انھیں اردو نہیں آتی تو پھر؟ علوم منتقل ہوں تو کیوں کر ہوں۔

پہلے، میرا بھی یہی خیال تھا کہ اردو بولنے والوں میں ایسے افراد کی قلت ہے، جو ذولسان ہوں اور ساتھ ہی دوسرے علوم پر دسترس بھی رکھتے ہوں۔ جب حیدرآباد کے روزنامہ ''منصف'' کی باز اجرائی ہونے کو تھی، اور حیدرآباد سے ایک اور اردو روزنامے کی اجرائی عمل میں آنے والی تھی، اجرائی سے دس دس دن پہلے سے، اخباروں میں اشتہارات شائع کیے جا رہے تھے، جن میں اخباروں کے مختلف ضمیموں کا تعارف دیا جا رہا تھا۔ ان میں سائنس سپلیمنٹ کا اشتہار بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کیا واقعی سائنس کا ضمیمہ شائع ہو سکے گا؟ لکھنے والے کہاں سے میسر آئیں گے؟ مواد کہاں سے دستیاب ہوگا؟ انگریزی رسالوں سے مواد مل بھی جائے تو اس کا ترجمہ کیوں کر ہوگا؟ لیکن اعلان کے مطابق سائنسی ضمیمے شائع ہوئے اور آج بھی بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔ گویا اخبار والوں کو سائنسی مضامین لکھنے والے میسر آ گئے ہیں۔ جدید سے جدید موضوعات و مسائل پر، سائنس اور ٹیکنالوجی کے نازک اور پیچیدہ تصورات کو اردو کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے۔ سائنس کی جدید اصطلاحوں کا بھی جہاں تک ممکن ہو سکا، ترجمہ کیا جا رہا ہے جن کا ترجمہ ممکن نہیں یا وقت طلب ہے، تو انگریزی اصطلاحیں، جوں کی توں استعمال کی جا رہی ہیں۔

مختصراً اردو میں بھی سائنسی مضامین، عصری علوم پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ ہمیں مایوس بھی نہیں کرتا۔ یہ مضامین اس تصور کی تردید کے لیے کافی ہیں کہ اردو میں عصری موضوعات پر اور خصوصاً سائنس پر نہیں لکھا جا سکتا۔ کمال ہے جو کام، اس مقصد، اسی غرض کے تحت قائم کیے گئے تعلیمی اداروں کو کرنا چاہیے تھا، وہ اخبار والے انجام دے رہے ہیں۔ وہ اس لیے کہ اخباروں کے اربابِ مقتدر نہ تو مرعوب ہیں نہ مایوس۔ نہ نمود پسند ہیں نہ شہرت پسند۔ ان کے پاس ایک واضح بصیرت موجود ہے۔ مجھے احساس ہے کہ لکھنے والے بھی کسی ستائش کی تمنا کے بغیر لکھ رہے ہیں۔ ان میں اپنی ملت کے تئیں ایک پرخلوص وابستگی، اور اپنی زباں کے تئیں ایک شیریں دیوانگی اور عمل کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ہمارے وہ معترضین، جو اردو میں نئے علوم کی پیش کش سے متعلق شک و شبہ میں مبتلا ہیں، ذرا ان مضامین کو ملاحظہ فرمائیں۔ جب اخباروں میں عصری علوم پر اور سائنسی موضوعات پر مضامین لکھے اور شائع کیے جا سکتے ہیں تو پھر اعلیٰ جماعتوں کے لیے سائنسی اور علمی کتابیں، درسی کتب کے طور پر کیوں نہیں لکھی جا سکتیں۔ وہ دانشور، اور تعلیمی اداروں سے وابستہ وہ اربابِ مقتدر، جو زندگی کے ہر پہلو، ہر عمل کو سود و زیاں کے پیمانے سے ناپتے ہیں اور ہر علمی سرگرمی کو اپنی نمود و ترقی کا ذریعہ بناتے ہیں، ذرا ان دیوانوں کی دیوانگی اور اخلاص کے عشرِ عشیر حصے سے خود کو متصف کر لیں تو اردو زبان میں عصری علوم پر مبنی درسی کتب بھی تیار کی جا سکتی ہیں۔ بس اس کے لیے مرعوبیت اور احساسِ کمتری اور فکری ژولیدگی کو ترک کرنا ہوگا۔ ایک واضح وژن (Vision) مضبوط ارادوں اور جذبۂ خالص کے ساتھ عمل پیرا ہونا ہوگا۔

پتہ:

Deptt. of Urdu,
Dean, School of Languages,
Linguistics & Indology,
Gachibowli, Hyderabad-500 032

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

حیات افتخار

غیر اردو دانوں کے لیے اردو رسم الخط کا تعارف

لسانی نقطۂ نظر سے اردو کا شمار ہند آریائی زبانوں میں ہوتا ہے۔ دیگر ہند آریائی زبانوں کے برخلاف اردو نے اپنے لیے سامی رسم الخط کا انتخاب کیا۔ پہلے پہل فارسی زبان نے عربی زبان سے اس رسم الخط کو مستعار لیا اور اپنی بعض خاص آوازوں کے لیے نئے حروف وضع کیے جیسے ژ، پ، چ، گ وغیرہ۔ پھر یہ رسم الخط فارسی سے اردو میں آیا۔ چونکہ عربی فارسی رسم الخط کے حروف تہجی اردو صوتیات کے لیے ناکافی تھے اس لیے ہمارے قدیم علما نے ٹ، ڈ، ڑ، بھ، پھ، جھ، چھ، جیسی آوازوں کے لیے نئے حروف وضع کیے اس طرح اردو کا اپنا رسم الخط ظہور میں آیا۔

ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے اردو نے بے شمار زبانوں سے استفادہ کیا ہے اور اس کا دامن ایک سے زیادہ لسانی خاندانوں کی زبانوں کے الفاظ سے مالا مال ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے ذخیرۂ الفاظ کا تقریباً تین چوتھائی حصہ سامی اور ایرانی ماخذ یعنی عربی فارسی زبانوں سے لیا گیا ہے۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں جو بے مثل تنوع اور رنگارنگی نظر آتی ہے وہ اُردو صوتیات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ پہلو اردو زبان کو دیگر زبانوں کے درمیان امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اس کی بدولت جہاں اردو میں وسعت، لوچ اور لطافت پیدا ہوئی ہے وہیں رسم الخط سے ایسی توقعات بھی وابستہ ہوگئی ہیں جن کو پورا کرنا آسان نہیں ہے۔

اردو بحیثیت ثانوی زبان پڑھاتے وقت اساتذہ کو پہلی دشواری بلکہ سب سے بڑی دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب طلبہ کو حروف تہجی سے متعارف کرایا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اردو کا کوئی معیاری قاعدہ دستیاب نہیں ہے۔ جو قاعدے دستیاب ہیں ان کا حال یہ ہے کہ حروف تہجی کی تعداد میں یکسانیت نہیں ہے۔ حروف تہجی کی تعداد مختلف قاعدوں میں مختلف ہوتی ہے۔ کسی میں '' ء '' شامل ہے تو کسی میں ہائے مخلوط '' ھ '' حروف تہجی میں شامل ہے۔

دنیا کی بیشتر زبانوں کے مقابلے میں، عربی اور فارسی کی طرح اردو رسم الخط کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے۔ جو طلبہ دیگر ہندوستانی زبانیں یا انگریزی سیکھ کر آتے ہیں اور وہ بائیں سے دائیں لکھنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں، انھیں سب سے پہلی دشواری اپنی عادت کو بدلنے میں آتی ہے اور یہ ظاہری بات ہے کہ عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے پہل اردو حروف تہجی کو شروع کرتے ہوئے حاشیہ (Margin) تو دائیں جانب رکھتے ہیں لیکن حروف لکھتے ہوئے ان کا ہاتھ بائیں سے دائیں جاتا ہے مثلاً

ب ق ل ی وغیرہ

ہر زبان کے رسم الخط میں دو طرح کے حروف ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے حروف کو مصوتہ (Vowel) اور دوسری قسم کے حروف کو مصمتہ (Consonant) کہتے ہیں۔ الفاظ کی تشکیل میں ان دونوں طرح کے حروف کا ملنا ضروری ہے۔

بیشتر زبانوں کے رسم الخط میں مصوتے اور مصمتے علاحدہ ہوتے ہیں۔ تقریباً عام ہندوستانی زبانوں کا یہی حال ہے لیکن اردو کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں یہ حروف تہجی میں مصوتے اور مصمتے دونوں ملے ہوئے ہیں چنانچہ ان کو الگ کرنے کی کوشش میں مصوتے کی نمائندگی کرنے والے چار حروف ہی ہاتھ آتے ہیں۔ مثلاً

ا و ی ے

اردو میں خفیف مصوتوں (Short Vowels) کو ''اعراب'' اور طویل مصوتوں کو '' حروف علت'' کہا جاتا ہے۔ خفیف مصوتوں کی آواز کے لیے جن علامتوں کا استعمال کیا جاتا ہے یعنی زیر، زبر، پیش ان کا التزام عام طور پر کتابوں میں نہیں کیا جاتا۔

اردو کے طویل اور خفیف مصوتوں کی کل تعداد کے بارے میں بیشتر ماہرین لسانیات کی رائے ہے کہ وہ دس ہیں۔

(1) واؤ کی تین آوازیں (واؤ معروف، واؤ مجہول، واؤ ماقبل فتح)

مثلاً	واؤ معروف	او۔دو
	واؤ مجہول	لَو۔لَون
	واؤ ماقبل فتح	اَو۔اور

(2) ی کی تین آوازیں (یائے معروف، یائے مجہول، یائے ماقبل فتح)

مثلاً	یائے معروف	ای۔ایجاد

یائے مجہول		ای۔ایڑی
یائے ماقبل فتح		ای۔خیر

(3) زیر، زبر، پیش اور الف مد

اس طرح کُل ملا کر دس مصوتے ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں اردو پڑھنے والوں کے لیے دشواری یہ ہے کہ مذکورہ دس مصوتوں کا اعرابی نظام مسلم نہیں ہے۔ یہاں عجیب وغریب انتشار ملتا ہے۔

اردو رسم الخط کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حروف لفظ بنانے میں ایک دوسرے سے جُڑ جاتے ہیں اور ایسی صورت میں بعض حروف ٹوٹ جاتے ہیں۔ عام طور پر لفظ بنانے میں زیادہ تر حروف کی ٹوٹی ہوئی شکلیں ہی استعمال ہوتی ہیں۔ ہم انھیں آسانی کے لیے انگریزی کی طرح چھوٹے حروف (Small Letters) کا نام دے کر طلبہ سے متعارف کروا سکتے ہیں۔ پہلے پہل حروف تہجی کی عام شکل یعنی بڑے حروف (Big Letters) سے طلبہ آشنا ہونے کے بعد چھوٹے حروف سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں کہ اردو رسم الخط صوری لحاظ سے نہایت ہی خوب صورت اور خوشنما رسم الخط ہے۔ اردو خطاطی کو مصوری کا درجہ دیا گیا ہے۔ سہولت کے لحاظ سے یا وقت کی کفایت کے نقطۂ نظر سے یہ ایک قسم کی مختصر نویسی ہے جس کی وجہ سے اسے بہت تیزی سے لکھا جا سکتا ہے۔ ایک جائزے کے مطابق اردو کا شمار سہل رسوم خط میں ہوتا ہے کیونکہ یہاں پر الفاظ لکھتے وقت قلم کو بار بار نہیں اٹھانا پڑتا ہے لیکن صوتی اعتبار سے اس کے سیکھنے اور سکھانے میں بعض الجھنیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب طلبہ کے سامنے ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حروف کو پیش کیا جاتا ہے۔

مثلاً ت ط

ث س ص

ذ ز ض ظ

ح ہ

اس کے علاوہ عربی اور فارسی سے ماخوذ الفاظ کو اردو میں لکھنے کا مسئلہ ہو، ہمزہ کے استعمال کا مسئلہ ہو، ہکار آوازوں کے لیے ہائے مخلوط (ھ) لکھنے کی بات ہو یا نون غنہ کے لیے علامتیں استعمال کرنے کا معاملہ ہو، استاد کے لیے اردو رسم الخط سکھانے کی راہ میں حائل بعض دشواریوں میں سے چند اہم دشواریاں کہی جاسکتی ہیں۔

کسی بھی زبان کے رسم الخط کو مکمل اور نقائص سے عاری نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ اردو رسم الخط کی بھی اپنی چند خامیاں ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے طلبہ کو بتائیں کہ اردو جیسی شیریں زبان کو سیکھنے کے لیے ان دشواریوں سے گزرنا ناگزیر ہے۔ اسی لیے اردو زبان کی نزاکتوں سے واقف شاعر داغ نے بھی کہا تھا:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ویسے اردو رسم الخط کو سائنٹیفک طریقے سے سکھانے کے لیے ماہرین لسانیات نے بعض کتابیں تیار کی ہیں جن سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کی شائع کردہ کتاب "An Introduction to Urdu Script-Reading and Writing" مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ گوپی چند نارنگ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے اردو سکھانے کی جو کتابیں تیار کی ہیں ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال اردو کے استاد کو اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں طلبہ کے ذہنی معیار، مادری زبان اور مقامی حالات کے پیش نظر اردو سیکھنے کے عمل کو دلچسپ بنانا چاہیے اس طرح وہ خود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے بہتر نتائج پیدا کرسکتے ہیں۔

پتہ:
Head Deptt. of Urdu, Quaide Milleth College,
Medavakkam, Chennai-601302

□□□

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کونداس/مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت -/24 روپے

محمد وجیہہ الدین جمال

مغربی بنگال میں اردو کی صورتِ حال

مغربی بنگال کے سابق وزیراعلیٰ جیوتی باسو نے اپنے دورِ اقتدار میں 1981 میں اس وقت کے ریاستی چیف سکریٹری مسٹر اے. کے. سین کے دستخط سے جاری شدہ سرکاری حکم نامے

i) G.O.No 20327 (100)ICA dtd 03.10.1981

ii) G.O.No 20905(100)ICA dtd.03.11.1981

کے ذریعے کلکتہ، گارڈن ریچ، اسلام پور اور آسنسول سب ڈویژن میں اردو کو دوسری سرکاری زبان دینے کا اعلان کیا تھا اور سرکاری کاموں کے لیے اردو کے استعمال کی اجازت دی تھی لیکن یہ سرکاری حکم نامہ سرکاری فائلوں کی تہہ میں دبتا چلا گیا اور رائٹرس بلڈنگ (سکریٹریٹ) سے نکل کر ان علاقوں تک نہیں پہنچ سکا جہاں کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مغربی بنگال میں تقریباً 40 فیصد اردو بولنے والے آباد ہیں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ شرح 26 فیصد ہے۔ ریاست کی 5 سے 7 لاکھ نیپالی آبادی کے لیے 1961 میں ہی نیپالی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ موجودہ وزیراعلیٰ بدھا دیب بھٹا چاریہ نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی بنگالی سال کے آغاز میں ریاست میں تمام سرکاری کام کاج بنگلہ زبان میں کرنے کا حکم جاری کیا اور دوسرے ہی دن سے یہ نافذ ہو گیا۔

اسکولوں میں غیر بنگالی طالب علموں کو چھٹے درجے سے انگریزی حروف تہجی پڑھا کر سکنڈری اسکول امتحانات کے سوال نامے انگریزی میں دیے جاتے ہیں۔ ہائر سیکنڈری میں بھی یہی مسئلہ ہے (مادھیامک میں صرف ریاضی کا سوال نامہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی دیا جاتا ہے) پھر گریجویشن کی سطح سے مقابلہ جاتی امتحانات میں صرف بنگلہ اور انگریزی میں جوابات لکھنے کی اجازت ہے جس سے گریجویشن یا اعلیٰ تعلیمات میں غیر بنگلہ طالب علموں کی تعداد متواتر کم ہوتی جاتی ہے۔

حکومت کی جانب سے غیر بنگالی طالب علموں کو بنگلہ زبان لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کا کوئی معقول بندوبست بھی نہیں ہے۔ اردو والے بنگلہ پڑھنے کو تیار ہیں لیکن حکومت کو پریشانی ہے کہ اگر اردو والے بنگلہ زبان پر عبور حاصل کر لیں گے تو ریاست میں اعلیٰ تعلیمی اداروں سے لے کر سرکاری نوکریوں تک میں ان کے لیے دروازے کھل جائیں گے۔ اردو اسکولوں میں مدتوں سے متعدد جگہیں محض ایس. سی. ایس. ٹی. کے ریزرویشن کی وجہ سے خالی پڑی ہیں۔ اردو اسکولوں کے لیے OBC امیدوار دستیاب ہیں پھر اردو اسکولوں میں ایس. سی. ایس. ٹی. کے بجائے او بی سی کو تو موقع ملے۔

2006 میں اردو میڈیم جونیئر، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں میں اسکول سروس کمیشن کے ذریعے 17 ہزار خالی نشستوں کو پُر کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اردو اسکولوں کے لیے 209 اسامیاں دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا یعنی کل 1.23 فیصد 209 میں 74 شیڈول کاسٹ، 34 شیڈول ٹرائب، 15 دوسری پسماندہ ذاتوں کے لیے، 02 جسمانی طور پر معذوروں کے لیے اور صرف 81 جنرل امیدواروں کے لیے ریاست میں ایس. سی. ایس. ٹی. کے ریزرویشن کے نام متعدد اردو اسکولوں میں اساتذہ کی نشستیں مدتوں سے خالی پڑی ہیں۔

2006 میں ہی کالجوں میں لکچرار کی تقرری کے لیے 1799 خالی نشستوں میں سے بنگلہ زبان کے لیے 100 ہندی کے لیے 18، نیپالی کے لیے 5، سنسکرت کے لیے 19 اور اردو کے لیے صرف 4 نشستوں کا اعلان کیا گیا ہے۔ جبکہ ریاست میں متعدد ایسے کالج ہیں جہاں اردو آنرز اور پاس کورس کا شعبہ قائم ہے اور وہاں ایک بھی کل وقتی لکچرار نہیں ہے۔ مدتوں سے جز وقتی لکچرار سے شعبے کا انحصار ہے UGC کے لیے ضابطے کے مطابق پاس کورس والے کالج میں تین کل وقتی لکچرار اور آنرز پانچ کل وقتی لکچرار پر مشتمل شعبہ ہونا چاہیے۔ بردوان یونیورسٹی کے تحت اگر آسنسول کے تین کالجوں کا جائزہ لیا جائے تو آسنسول بدھان چندرا کالج اردو پاس کورس شعبے میں صرف ایک کل وقتی لکچرار ہے۔ بنواری لال بھلوٹیا کالج آسنسول پاس کورس (اردو) میں ایک بھی کل وقتی لکچرار نہیں۔ تربینی دیوی بھلوٹیا کالج رانی گنج اردو آنرز شعبے میں بھی کل وقتی لکچرار ہیں۔

اردو زبان کے ساتھ ایم. اے. پاس کرنے والوں کے لیے بی. ایڈ. میں داخلے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ریاست کی کسی دوسری یونیورسٹی سے آنرز کرنے کے بعد صرف کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) کی سہولت ہے جو کافی دقتوں بھرا معاملہ ہے۔ پھر گنے چنے امیدوار اگر ایم. اے. کے بعد بی. ایڈ. کرنا چاہیں تو اردو زبان والوں کے لیے بی ایڈ میں داخلے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ پوری ریاست میں صرف ایک جونیئر بیسک ٹریننگ کالج ہے جو تالی کل ہگلی میں واقع ہے۔ پوری ریاست کی اردو آبادی کے لیے صرف ایک ٹریننگ کالج، ناکافی تھا اب حکومت نے نیا فیصلہ یہ کیا ہے کہ داخلے صرف مقامی (طلبہ) کو ملیں گے۔ اردو کے طلبہ و طالبات کے لیے اس کی سہولت نہیں ہوگی۔ چند پرائیویٹ کالج قائم ہوئے تو حکومت نے اس پر پابندی لگا دی۔ آخر عدلیہ نے اس پابندی کو کالعدم قرار دیا۔ معاملہ ابھی التوا میں ہی پڑا ہے۔

ریاست میں اردو اکادمی قائم ہے لیکن اس کی کارگزاری کا دائرہ اکادمی کے اراکین شعرا ادبا کی کتابیں چھاپنے یا کچھ وظائف دینے تک محدود ہے۔ ابھی سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری کے نصاب میں تبدیلی آئی ہے لیکن اب تک نئے نصاب کی کتابیں اکادمی فراہم نہیں کرسکی ہے جبکہ بنگلہ زبان میں نصاب کی تمام کتابیں دستیاب ہیں اور اکادمی بنگلہ زبان والوں کو اردو سکھانے کے لیے سرٹیفکیٹ کورس چلا رہی ہے یہ ایک اچھا کام ہے۔ حکومت ہند نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم کرکے اردو والوں کو تعلیمی پسماندگی سے نکالنے کا ایک مؤثر طریقہ کار پیش کیا۔ اس یونیورسٹی کی اسناد کو ملک کی تمام ریاستیں قبول کرتی ہیں لیکن حکومت مغربی بنگال کی نگاہ میں اس کی اسناد کی اہمیت نہیں۔ مغربی بنگال کے وزیر محمد امین یونیورسٹی کو اپنا ریجنل سنٹر قائم کرنے کے لیے سالٹ لیک میں زمین فراہم کرنے کو تیار ہیں لیکن اسناد سے متعلق ان کی زبان بند ہے۔ دستور ہند کے آرٹیکل 30(A) کے تحت لسانی اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کے ادارے قائم کریں اور تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری کریں لیکن حکومت مغربی بنگال کا رویہ یہ ہے کہ ایسے تعلیمی اداروں کو نہ تو خود منظوری دیتی ہے اور نہ ہی ICSE یا CBSE منظوری حاصل کرنے دیتی ہے۔

کلکتہ کارپوریشن کے اردو میڈیم اسکولوں میں دسمبر 1995 میں اساتذہ کی تقرری کے لیے اشتہار شائع کیے گئے۔ تحریری وزبانی امتحانات کے بعد 1995 میں 75 مردوں اور 74 خواتین پر مشتمل پینل تیار کیا گیا۔ صرف ایک تہائی امیدواروں کی تقرری کے بعد بقیہ کو چھوڑ دیا گیا جبکہ دیگر زبانوں کے تمام امیدواروں کی تقرری کردی گئی۔ اس سلسلے میں اس وقت کے کارپوریشن کے میئر سے مسلسل رابطہ کیا گیا لیکن کوئی بات نہ بننے پر مجبوراً عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ 2000 میں دائر کیے گئے مقدمے کا فیصلہ اگست 2004 کو ہوا اور کلکتہ کورٹ نے پینل کے بقیہ امیدواروں کی تقرری کو لازمی قرار دیا۔ اس پر کارپوریشن نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ ہائی کورٹ کی ڈویژن بنچ نے اپیل کو خارج کرکے سابقہ فیصلہ برقرار رکھا۔ دریں اثنا بایاں محاذ کا بورڈ ٹوٹا اور ترنمول کانگریس کا بورڈ بنا۔ اس بورڈ نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ موجودہ خالی نشستوں میں اساتذہ کے لیے اسکولوں میں کل 39 آسامیوں کی جگہیں خالی ہیں۔

ریاست میں اردو والوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں۔

(الف) ابتدائی جماعتوں سے لے کر ہائر سیکنڈری سطح تک نصاب کی معیاری کتابیں اردو زبان میں فراہم کی جائیں۔

(ب) بنگلہ زبان کو اردو طالب علموں کے لیے سیکنڈری سطح تک لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل کیا جائے۔

(ج) سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری میں انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی سوال نامے دیے جائیں۔

(د) اعلیٰ تعلیم اور مقابلہ جاتی امتحانات میں اردو والے امیدواروں کو مادری زبان میں جوابات لکھنے کی سہولت فراہم کی جائے۔

(ہ) اردو والوں کو اپنے طور پر قائم کیے گئے اداروں کو سرکاری منظوری دی جائے یا پھر انھیں CBSE یا ICSE سے منظور کرانے کے لیے NOC بلا عذر فراہم کیا جائے۔

(و) اردو اکادمی سنجیدگی سے اردو زبان کی ترویج واشاعت میں حصہ لے۔

(ز) اردو اسکولوں میں اساتذہ کے لیے مخصوص ایس سی. ایس. ٹی. نشستوں کو او بی سی میں بدلا جائے۔

(ح) مغربی بنگال کے موجودہ اردو اسکولوں کی انتظامی بدحالی پر اسکول انتظامیہ بلاتعصب توجہ دے۔

(ط) کلکتہ کارپوریشن کے اردو اسکولوں کے معلق اساتذہ کی فوری تقرری کی جائے۔

مغربی بنگال کے اردو والوں کو اگر مذکورہ سہولتوں میں سے چند بھی فراہم کرادی جائیں تو کسی ریزرویشن یا کوٹے کی تخصیص کی ضرورت نہیں ہوگی۔

پتہ:
Shahjahan Manzil,
156, N.R.R. Road.

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات: 239، قیمت: -/96 روپے

دویا گاندھی

ایجوسیٹ: تعارف و تجزیہ

ڈھائی سال قبل انڈین ریسرچ اسپیس آرگنائزیشن (ISRO) نے میڈیا کی خیرہ کن روشنی میں Edusat کو خلا میں چھوڑا تھا، یہ دنیا کا پہلا سیارچہ ہے جو محض تعلیم کے لیے مختص ہے۔ یہ اس وقت کے اسرو کے چیئرمین کے کستوری رنگن کی ذہنی اپج تھی جو جی مادھون نایر کے دور صدارت میں خلا میں چھوڑا گیا۔ 20 ستمبر 2004 کی شام کو جب یہ سیارچہ خلا میں چھوڑا گیا تو اس سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ تعلیم کے امکانات اچانک لامحدود معلوم ہونے لگے تھے۔ اسرو (ISRO) کی پیشین گوئی کے مطابق اسپیس ٹیکنالوجی کی رسائی اب محروم لوگوں تک ممکن ہے ساتھ ہی دیہی اور شہری اسکولوں اور کالجوں کے درمیان خلا کو پر کرنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوئی ہے۔ مزید برآں استاد اور شاگرد کے تناسب میں کمی کے مسئلہ کو ایجوسیٹ کی کلاسوں کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔

ایجوسیٹ 12 واصل مرسل (Transponders) سے لیس ہے اور ہر ایک تقریباً 36 میگاہارٹز کی اہلیت رکھتا ہے، جو پورے ملک میں تکنیکی یونیورسٹیوں اور پرائمری اسکولوں کے 10,000 کلاس روم میں لیکچر کی ترسیل کرتے ہیں۔ ان میں کرناٹک کی وسویشورایا ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی (VTU)، نئی دہلی کی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، چینئی کی انا یونیورسٹی، راجستھان کا ٹیکنیکل ایجوکیشن بورڈ، کولکاتا کی ویسٹ بنگال یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی اور امپھال کی منی پور یونیورسٹی شامل ہیں۔ کرناٹک کی VTU اور ڈپارٹمنٹ آف اسکول ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ (DSERT) تکنیکی کالجوں اور پرائمری اسکولوں کے لیے لیکچر تیار کرتے ہیں۔ ماہرین فن لیکچر دیتے ہیں اور DSERT میں ابلاغی ربط (Uplink) کی سہولیات کے ساتھ اسٹوڈیو سے براہ راست نشر کیا جاتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا ایجوسیٹ کا تصور کسی معیاری تبدیلی کا باعث ہے؟ اسکولوں اور کالجوں کے ردعمل سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس پروجیکٹ سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا گیا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایجوسیٹ موجودہ نصاب پر تھوپا گیا ہے۔ ISRO نے سیارچہ اور لانچ وہیکل کی قیمت کا تخمینہ 450 کروڑ روپے لگایا تھا تاہم مواد کی تیاری، بنیادی ڈھانچے اور تنخواہ کو شامل کرتے ہوئے غیر سرکاری اعداد وشمار کے مطابق اس پروجیکٹ پر اندازاً 800 اور 900 کروڑ روپئے کا خرچ آیا ہے۔ کرناٹک کی VTU اس سیارچے کی سب سے اہم شریک کار ہے اور جملہ 120 کالج اسی یونیورسٹی کے ماتحت ہیں۔ ان میں سے اکثر دیہی علاقوں میں ہیں اور ان تمام کالجوں کی ایجوسیٹ پروگراموں تک رسائی ممکن ہے۔ اس کے موضوعات میں مادوں کی قوت، ریاضی اور ساختیاتی تجزیہ جیسے موضوعات پر لیکچر شامل ہیں۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے چمراج نگر ضلع کے تقریباً 900 اسکول ریاضی، انگریزی اور سائنس پر اس سیارچے کے توسط سے نشریات موصول کرتے ہیں۔

ایجوسیٹ کے افتتاح کے چند ہی مہینوں بعد یعنی 2005 میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز نے وی ٹی یو کے خصوصی حوالے سے پروجیکٹ کے مثبت اثرات کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آزمائشی اور عملی طور پر نیم پذیر مراحل میں چند مہینوں کے اندر ہی تکنیکی، اداراتی، انتظامی اور عملی بنیادوں پر اس میں بہت سی کمیاں تھیں۔ رائٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ کے تحت دی ہندو نے 22 دسمبر کو ایک درخواست دے کر ISRO سے NIAS کی رپورٹ کی ایک کاپی حاصل کی۔ جو ایک ماہ بعد موصول ہوئی۔ NIAS نے ایک ہزار سے زائد طلبہ کا انٹرویو لیا تھا جن میں سے 73 فیصد طلبہ نے ایجوسیٹ کے پروگرام میں شرکت ہی نہیں کی۔ پروگرام کی کامیابی کی کنجی یعنی سیارچے کا متعامل نظام یا تو غیر موثر ہے یا پھر بہت مشکل اور غیر مستعمل نشریات کا سمعی و بصری معیار بھی ناقص ہے۔ اکثر اساتذہ کے مطابق ایجوسیٹ پروگرام کا وقت ان کے لیکچر کے وقت سے ٹکراتا ہے۔ NIAS کے مطابق پیش کردہ جملہ مواد ملٹی میڈیا کی صلاحیت اور استطاعت کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں۔ NIAS اس نتیجے پر پہنچا کہ کلاس روم میں تدریس کی تکمیل یا کم از کم نجی ٹیوشن کی ضرورت کو کم کرنے کی اہلیت رکھنے والے ان نئے اقدام میں واضح مقاصد کی کمی تھی۔ NIAS کی رپورٹ کے مطابق منصوبہ سازی میں ''اوپر سے نیچے''

کا طریقہ اپنایا گیا تھا جس سے درس و تدریس کا معیار اور طلبہ کی حاضری متاثر ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق ISRO نے ایک بڑا پروجیکٹ قبل از وقت ہی میدان میں اتار دیا۔

دو سال کی مدت گزرنے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ NIAS کی سفارشات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ آج بھی مختلف ریاستوں میں ISRO اور VTU کے فراہم کردہ ٹی.وی. اور ڈش سے لیس ٹیکنکل کالجوں میں ایجوسیٹ کی سہولیات دستیاب ہیں جہاں روزانہ 9 گھنٹے ایجوسیٹ پروگرام موجود تو ہیں لیکن انھیں کوئی دیکھنے والا ہی نہیں ہے۔ VTU ای لرننگ کے اسپیشل آفیسر جی.ایل. شیکھر کے مطابق کالجوں میں صرف 40 فیصد طلبہ ہی ایجوسیٹ پروگرام کو برابر دیکھتے ہیں لیکن اگر ہم طلبہ و اساتذہ کی باتوں پر یقین کریں تو یہ تعداد کافی کم ہے۔

ہم نے طلبہ، اساتذہ اور ایجوسیٹ سے مستفید ہونے والے VTU کے پانچ کالجوں کے پرنسپلوں سے بات کی۔ بی ایم ایس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے طلبہ کے مطابق ''ہم ایجوسیٹ پروگرام میں کیوں شامل ہوں۔ جب اس پروگرام کو ہمارے ہی اساتذہ نے تیار کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ '' وہ اپنے کالج میں کسی ایسے طالب علم کو نہیں جانتے ہیں جو ایجوسیٹ کے پروگرام کو دیکھتا ہو'' بنگلور کے ایک دوسرے مشہور انجینئرنگ کالج آروی کالج کے طلبہ بھی اس بات سے متفق ہیں۔ ایم ایس رمیّہ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں کمپیوٹر سائنس کی ایک سینئر طالبہ کا کہنا ہے کہ اس نے'' ایجوسیٹ کے بارے میں سنا ہے'' اس نے یہ بھی بتایا کہ '' ایجوسیٹ کا کمرہ اس کے کلاس روم کے سامنے ہے اگرچہ اس میں کبھی کوئی ہوتا ہی نہیں ہے۔'' چھوٹے کالجوں میں اساتذہ کی تعداد بہت کم ہے۔ کیا ایجوسیٹ اس خلا کو پر کرسکا ہے؟ بیجاپور میں ڈاکٹر پی.جی. ہالکٹی کالج آف انجینئرنگ و ٹیکنالوجی کے اساتذہ نے اس پروگرام کو اصل نصاب کے ساتھ ضم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں بھی ایک طالب علم نے بتایا کہ اس کو بھی وقت کی کمی کے باعث ایجوسیٹ کی کمپیوٹر سائنس اور الکٹرانکس کی کلاس آخر کار چھوڑنی پڑی۔

'' انجینئرنگ کالجوں میں 85 فیصد حاضری ضروری ہوتی ہے اور ایجوسیٹ ہمارے اصل ٹائم ٹیبل سے ٹکراتا ہے۔'' اس ضمن میں ہم سی.ڈی. (C.D.) کو ترجیح دیں گے جسے اپنی سہولت کے مطابق دیکھ سکتے ہیں۔ سی.ڈی. کی درخواست ہر کالج میں منظور کی گئی۔ جو سیارچے کے متعامل نظام میں کمی اور نقص کا باعث ہے۔ سوال پوچھنے کے لیے محض sms اور ای میل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس طرح پورے صوبے کے طلبہ کے سوالات جمع ہو جانے سے ترسیل و ابلاغ زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔ کیا ان عوامل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کی سٹلائٹ ٹیکنالوجی زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی ہے؟ اور اس طرح کی مہم کے لیے نہ صرف استعمال کی سطح پر بلکہ منصوبہ بندی اور ڈیزائن کی سطح پر بھی حصے داروں کی شرائت ہونی چاہیے۔ حال ہی میں حاسد پروفیسروں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جو جرنیل کو شروع ہی نہیں کرتے تھے جو محض VTU کے وائس چانسلر ملویا ریڈی کو حیران و پریشان کرنے کے لیے تھا۔ چونکہ وائس چانسلر نے کالجوں کو عدم تعاون کے لیے یونیورسٹی سے ان کے الحاق کو ختم کرنے کی دھمکی بھی دی تھی۔

جہاں تک ایجوسیٹ پروگراموں کے مواد کا تعلق ہے تو اس کے متعلق یہ تشویش ہے کہ اس کے ذریعے'' چاک اور بات'' کی تبدیلی سے زیادہ کچھ خاص نہیں ہوا ہے۔ سٹیلائٹ کے ذریعے تعلیم خاص کر پرائمری اسکول کی سطح پر، سٹلائٹ کے تدریسی مضمرات کے بارے میں بنگلور میں مقیم ماہر تعلیم گیتھا نارائن کے بقول ــــ'' تعلیم تہذیبی اعتبار سے کبھی بھی غیر جانبدار سیاق میں یکساں نہیں ہوتی ہے اس لیے بچوں کا باہم متعامل ہونا ضروری ہوتا ہے۔'' لیکن اس پروگرام کا استعمال کرنے والے کالجوں کے لیے تجزیے سے کوئی باقاعدہ طریقۂ کار نہیں ہے NIAS کی غیر اطمینان بخش رپورٹ کے بعد بھی اسرو نے VTU ایجوسیٹ کا مزید تجزیہ شروع نہیں کیا۔'' اسرو کا وی ٹی یو کو پورے ملک کے کالجوں کے لیے ایک مثالی نمونہ تصور کرنا تشویش کا باعث ہے کیونکہ اس سے دوسرے صوبوں کے کالجوں میں ایجوسیٹ کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ بھاسکر نرائن کے مطابق ہریانہ کے ٹیکنکل کالج کافی فعال ہیں اور ایجوسیٹ پر مستقل نظر رکھتے ہیں مزید برآں وہ ایجوسیٹ سے وابستہ دوسرے صوبوں کے کالجوں سے متعلق کچھ کہنے سے بھی قاصر ہیں۔ البتہ اسرو نے حال ہی میں مواد کی تیاری اور پرائمری اسکولوں کی سطح پر اس کی نگرانی کرنے والے DSERT سے اس سیارچے پر نظر ثانی کے لیے کہا ہے۔

(بشکریہ'' دی ہندو'' 13 مارچ 2007، نئی دہلی)

انگریزی سے ترجمہ: ابوشہیم خاں

پتہ:
J3A/28A, Khirki Ext.,
Malviya Nagar, New Delhi-110017

□□□

شرجیل احمد خاں

فن میں مقصدیت ارسطو کی نظر میں

ارسطو کے پیش نظر یہ سوال تھا کہ آخر فن کا مقصد کیا ہے؟ اس ضمن میں ارسطو نے فن میں دو قسموں کی نشان دہی کی ہے۔

(1) کارآمد فن اور

(2) فنِ لطیف۔

''کارآمد فن'' ہماری ضروریاتِ زندگی پوری کرتا ہے۔ وہ ایسی اشیا کی تشکیل کرتا ہے جو ہماری روزانہ زندگی میں کام آتی ہیں۔ اس کے مقابل فنِ لطیف (Fine Arts) کا مقصد مسرت و انبساط بہم پہنچاتا ہے۔ ''کارآمد فن'' مثلاً طباخی (Cookery) بھی باعثِ مسرت ہو سکتا ہے، لیکن یہ طباخی کا جوہر نہیں ہے۔ اس طرح فنِ لطیف بھی سیاست داں کے ہاتھوں حربہ بن سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں متعلقہ فن کی اصل مقصدیت کی نمائندگی نہیں ہوتی۔

ارسطو مسرت میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق جائز سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کے خیال میں فن سے حاصل شدہ خوشی بھی اعلیٰ و ادنیٰ ہو سکتی ہے۔ فن سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ سیر و تفریح کی مسرت کے مماثل ہے لیکن فن میں سیر و تفریح بہ ذاتِ خود مقصد نہیں ہے۔ یہ ماندگی کا ایک وقفہ ہے تاکہ ہم تازہ دم ہو کر کارزارِ حیات میں آگے قدم بڑھا سکیں۔ سیر و تفریح ایک ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ اس میں مسرت کا وہ عنصر موجود نہیں ہوتا جو زندگی کو اعلیٰ مقصدیت بخشتا ہے۔

اگر چہ ارسطو مختلف اصنافِ فن میں درجہ بندی نہیں کرتا اور نہ وہ المیہ سے حاصل شدہ مسرت کو طربیہ سے برتر سمجھتا ہے، لیکن وہ موسیقی کی مختلف اقسام میں تفریق ضرور کرتا ہے۔ اسی سے ہمیں اس معیار کا علم ہو جاتا ہے جس کے ذریعے ارسطو مختلف فنون کی خوبیوں کی تصدیق کرتا ہے۔ موسیقی تفاعل کے علاوہ بچوں کی تفریح کا سامان بھی ہے۔ یہ بچوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے، لیکن باشعور اور باذوق انسان کے لیے یہی موسیقی دائمی مسرت اور طمانیت کے ایک وسیلے کی حیثیت لے لیتی ہے، شرط یہ ہے کہ سامعین اس سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

ارسطو اس بات پر زور دیتا ہے کہ مضحک عموماً سنجیدہ سے ادنیٰ ہے۔ یہ صرف انسان کو تفریح مہیا کرتا ہے تاکہ وہ زیادہ سنجیدہ کام کرنے کے لائق ہو جائے۔ ارسطو کے مطابق زندگی کا یہ اصول ادب میں بھی کارفرما ہے۔ ادب میں طربیہ کی مثال لیجیے۔ طربیہ کھیل کے مماثل ہے۔ طربیہ ہم میں اسی طرح کی خوشی و مسرت کا احساس پیدا کرتا ہے جو سیر و تفریح سے ملتی ہے لیکن فن اپنے منتہائے خیال میں ذہن کی سرگرمیوں میں سے ایک ہے، جو دراصل انسان کی بہتری اور خوش حالی کی امین ہیں۔ اس کا مقصد مسرت ہے، ایسی مسرت جس میں مکمل سراحت (Repose) مکمل توانائی میں ضم ہو گئی ہو، ہمیں ان مسرتوں کو ابتدائی فن میں رائج بھونڈی نقل سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ فن نقل اور نمائندگی سے کہیں برتر اور عمیق ہے۔ ارسطو مصوری اور دیگر فنون کے ذہنی پہلو پر زور دیتا ہے، لیکن اس کے خیال میں شاعری، جو فنونِ لطیفہ میں سب سے اعلیٰ مقام رکھتی ہے، کا تعلق جذبات سے ہے نہ کہ تعقل سے۔ شاعری عقل کے تار نہیں چھیڑتی۔ یہ احساس کی جوت جگاتی ہے۔ ارسطو کی نظر میں فن اور فلسفہ، گو دونوں کے علاقے جدا ہیں، ایک دوسرے کے تکملہ ہیں۔ فنِ لطیف کی ساحری ہم میں وجد کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کی خوشی اور وجد کا احساس ہمیں فلسفیانہ فکر میں بھی ملتا ہے۔ دونوں خود کفیل ہیں اور زندگی کے پیالے کو خوشی و انبساط کے پھولوں سے بھر دیتے ہیں، جو زندگی کی غرض و غایت بھی ہے۔ اس ضمن میں ارسطو اور افلاطون کے موقف مختلف ہیں۔ افلاطون کے نزدیک لطف اندوزی ایک عامیانہ اور پست جذبہ ہے اور جمہوری خوشی تو موجبِ ذلت و رسوائی ہے۔ ایک نمائندہ فن (مثلاً موسیقی) انحطاط کا باعث ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ عوام کو خوش کرنے کا محض ایک وسیلہ ہے۔ اس کو ذہنی سرگرمی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ شاعری بھی افلاطون کے مطابق کچھ اسی طرح کا فن ہے۔ اس کا انداز خطیبانہ اور خوشامدانہ ہے۔ شاعری گمراہی کو دعوت دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افلاطون کے نزدیک قصیدہ گوئی کی طرح شاعری ابدی مسرت کی متلاشی نہیں، بلکہ لمحاتی مسرت تک اپنے کو محدود رکھتی ہے یہ خیال کہ موسیقی کی اعلیٰ خوبی کی جانچ مسرت سے کی جا سکتی ہے، افلاطون کی نظر میں ایک کافرانہ خیال ہے۔ اگر مسرت کو پیمانہ مان لیا جائے تو اس کے لیے ایسے سامعین کی ضرورت ہوگی جو عقل و ہنر میں یکتا ہوں۔ افلاطون اپنی تصنیف Philobus میں مسرت، خاص کر جمالیاتی مسرت کو 'خیر' کے زمرے میں سرفہرست نہیں رکھتا، بلکہ اس کو پانچواں مقام دیتا ہے۔

ارسطو بھی لطف اندوزی کو گمراہ کن سمجھتا ہے، لیکن محدود معنوں میں۔ اپنی معرکہ آرا تصنیف "Ethics" میں ارسطو اقرار کرتا ہے کہ لطف اندوزی کی خواہش لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اس ضمن میں وہ یونانی حسینہ ہیلن کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی خوب صورتی اور پر لطف اداؤں سے Troy کے بزرگوں کو گمراہ کیا اور انھیں غلط راستے پر لے گئی۔ وہ مزید کہتا ہے کہ عوام کو اعلیٰ اور حقیقی لطف اندوزی کی پہچان نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے کہ انھیں اس کا کوئی تجربہ نہیں

ہوتا، لیکن پھر بھی ارسطو اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ لوگوں کو اشیا سے مناسب موقعوں پر لطف اندوز یا غم زدہ ہونے کی تعلیم ملنی چاہیے۔ اپنی تصنیف "Metaphysics" میں ارسطو نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ جو لوگ فنونِ لطیفہ کا شغل رکھتے ہیں وہ ''کارآمد فن'' کے پیروکاروں سے کہیں اعلیٰ اور معتبر ہیں۔ وہ اس لیے کہ اپنے کو اشیا کے استعمال تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ان کے اندرون تک اتر کر ان سے سچی خوشی اور مسرت حاصل کرتے ہیں۔

افلاطون کا موقف ہے کہ شاعری یا مصوری بے ضرر لطف کا باعث ہوسکتی ہے، لیکن پھر بھی اپنی نوعیت میں وہ فقط تفریح اور وقت گذاری کا سامان ہے۔ اس کے مطابق شاعری طب، کھیل، ورزش اور کھیتی باڑی جیسی سنجیدہ انسانی سرگرمیوں کی بہ نسبت کم حیثیت کی حامل ہے، لیکن جیسا کہ مذکور ہوا، ارسطو فن برائے تفریح اور فن برائے جمالیاتی تسکین میں تفریق کرتا ہے۔ المیہ کی مثال لیجیے۔ المیہ اعمال کی نقل ہے جو کسی معنی میں بھی تفریح نہیں کہی جاسکتی، کیونکہ المیہ فن کی حیثیت سے ''خیرِ اعلیٰ'' ہے اور زندگی کی معنویت سے منسلک ہے۔ اس لیے فنونِ لطیفہ ارسطو کی نظر میں قارئین کو جمالیاتی تسکین بہم پہنچاتے ہیں۔ فنکار اپنے لیے لکھتا ہے یا فن کار کا منشا خود اپنی (فن کار کی) جمالیاتی تسکین ہے، ارسطو اس طرح کے خیالات نہیں رکھتا تھا اور نہ اس زمانے میں فن اور فنکار کے متعلق اس طرح کے خیالات رائج تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں اہلِ یونان فنکار کو نہیں، فن کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی نظر میں فن ہی جمالیاتی تسکین پہنچانے کا واحد ذریعہ تھا۔ اس ضمن میں فنکار کا کوئی رول نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں فن خود کفیل ہوتا ہے۔ ارسطو کی نظر میں فن کے قاری کو تخلیق کار سے کوئی مطلب نہیں ہوتا بلکہ اس تخلیق سے ہوتا ہے جو فنکار خلق کرتا ہے۔ تخلیق ایک Finished Product کی طرح ہے جس سے قاری محظوظ ہوتا ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک فلاسفر کو اپنے مفروضات سے خوشی و مسرت کا احساس ہوتا ہے کیونکہ مفروضات اس کے اپنے ذہن کی سرگرمیاں ہیں اور اسی لیے اپنا مقصد آپ ہیں۔ اس کے برعکس فن کی مسرت فنکار کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کے لیے ہے جو فنی تخلیق سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اگر فنکار قاری کی خوشی اور مسرت میں شریک ہے تو ایک فنکار کی حیثیت سے نہیں بلکہ قاری کی حیثیت سے۔

جدید نقاد، ارسطو کے اس نظریے میں شدید خامیاں پائیں گے کہ ارسطو فن کا مقصد جذباتی مسرت میں ڈھونڈتا ہے نہ کہ ان مقاصد کے حصول میں، تخلیق جن کی تکمیل کی متقاضی ہے۔ فنی تخلیق خود کفیل ہوتی ہے۔ فن کا مقصد زندگی میں جاری وساری (Immanent) ہے۔ یہ زندگی سے ماورا نہیں ہے۔

فن جو تاثر پیدا کرتا ہے، چاہے فوری ہو یا مابعد، چاہے مسرت ہو یا اخلاقی اصلاح، اس کا تعلق شے سے نہیں ہوتا کیونکہ فن ہر شے کے اندرون میں مضمر ہے، خارج میں نہیں۔ ایک فنکار کو خارجی اثرات سے بہت کم تعلق ہوتا ہے جس طرح خود فطرت حیاتیاتی اعمال میں اپنا مقصد خود پالیتی ہے۔

یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ ارسطو کے مکتبِ فکر کے مطابق کسی شے کا مقصد خود شے میں موجود رہتا ہے اور مقصد اپنے پایۂ تکمیل کو پالیتا ہے، جب شے اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اور وجودی قوانین کے تحت اپنا کام انجام دے دے۔ ارسطو کے نزدیک دنیا کی ہر شے ایک سبب آخر ہے اور یہی اس شے کا مقصد بھی ہے۔ کوئی شے جس مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے وہی اس کے وجود کا اصل سبب بھی ہے۔

ارسطو کے نزدیک کسی شے کی اصل ماہیت (Nature) کا اظہار ان ذرائع سے ممکن ہے جن سے اشیا کی کارکردگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی بات فنی تخلیق پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر ہم کسی ادبی تخلیق میں جذباتی اثرات کو جاننا چاہیں تو ہمیں تخلیق کے مشمولات پر نظر رکھنی ہوگی۔ ارسطو کے نقطۂ نظر سے فن اعلیٰ زندگی کا جوہر ہے، فن ہم میں پائدار مسرت کا احساس جگاتا ہے جو عام زندگی میں نہیں ملتا۔

اگرچہ فن کی مقصدیت ایک طرح کا احساس ہے، لیکن یہ احساس انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ لذت کا احساس فن کے جوہر کی نفی نہیں کرتا، جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ دراصل یہ معروضی حقیقت کا موضوعی پہلو ہے۔ ہر صنفِ شاعری اپنے ساتھ خوشی لاتی ہے اور یہی خوشی شاعری کی تصدیق کا پیمانہ ہے۔ المیہ سے خوف اور ترحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور شاعر کا کام ان جذبات کو اجاگر کرنا ہے۔ اگر شاعر جذبات کو ابھارنے میں کامیاب ہوگیا تو گویا شاعر نے سچے فنکار کا رتبہ حاصل کرلیا۔ المیہ میں فن کی خوبی کی جانچ اس بات کی مرہونِ منت ہے کہ شاعر کس درجہ تک سامعین میں ترحم وخوف کا جذبہ ابھارتا ہے۔ ارسطو کے تشکیل دیے ہوئے تمام ضابطے ان امور کو اہم ٹھہراتے ہیں۔ ارسطو کے مطابق المیہ میں خوشی کا احساس محض اتفاق نہیں ہے بلکہ یہ لازمی طور سے اس شے سے منسلک ہے جو ان جذبات کو ابھارنے کا باعث ہے۔ اگرچہ فن کا اصل تفاعل سامعین کے دل میں خوشی و مسرت کا احساس جگانا ہے، پھر بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس سے حاصل موضوعی ارتسام دائمی اور آفاقی عنصر کا حامل ہے۔ فن سے حیاتی انبساط جو رنگ و آہنگ اور شعریت سے حاصل ہوتے ہیں وہ محض لذت بخش ہی نہیں بلکہ ''خیرِ اعلیٰ'' بھی ہیں اور اسی سے زندگی میں مقصدیت کی جلوہ گری ہے۔!!!

پتہ:
3- Bhaikanpur, Bhagalpur (Bihar)

□□□

شہپر رسول

آغا حشر کاشمیری کی شاعری
(غزل گوئی کے حوالے سے)

شاعری پر کسی اخلاقی نظریے کی اشاعت، کسی مخصوص فلسفے کی علمبرداری یا کسی سیاسی منشور کے پرچار کا بار نہیں لادا جاسکتا۔ شاعر اپنے ذاتی شعور و بصیرت، نفسیاتی میلان اور تہذیبی نیز معاشرتی اثرات و انسلاکات کی بنیاد پر اپنے مخصوص خیالات و محسوسات کو شعری تخلیق کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ محسوسات و خیالات شاعر کی داخلی تہذیب اور زیست کے خارجی مظاہر کے متصادم ہونے یا باہم اثرانداز ہونے کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض حضرات کی رائے میں زیست کے خارجی مظاہر کی آگہی اور معاشرتی شعور اس ضمن میں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور بعضوں کی نظر میں شعور و لاشعور، نفسیاتی نہاں خانوں اور داخلی جبلتوں کی آماجگاہ ہونے کے سبب محسوسات و تخیل کو شاعری میں اہم مقام حاصل ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی رائے میں:

''اہمیت دونوں پہلوؤں کی ہے مگر ترجیح فنکار کے تخیل کو حاصل ہے۔ فن کار کا یہ تخیل چونکہ علوم کے بنیادی تصورات کی طرح ٹھوس نہیں ہوتا بلکہ سایوں اور پرچھائیوں کی طرح دھندلا اور چاندنی کی طرح لطیف ہوتا ہے چنانچہ اس کی پہچان کے لیے علوم کے پیمانے کافی نہیں۔ ہاں ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس کی حقیقی پہچان اور اس کا صحیح عرفان، اس کے آداب، رمز و ایما اور علامات کی زبان سمجھنے پر ہی ممکن ہے۔''

میرے خیال میں آغا حشر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے درج ذیل اشعار پر نظر ڈالنا بے سود نہ ہوگا:

حقیقت شعر کی اے حشر بس ہم یہ سمجھتے ہیں
کہ بجلی ہو اثر میں اور پانی میں روانی ہو

تہی دستِ اثر ہے شعر تو ہذیانِ لفظی ہے
کہ لطف اے حشر تخیل و بیانِ داستاں تک ہے

مرے ہر شعر میں اے حشر ہے مستی و رنگینی
غزل میری شبابِ یار کی تصویر ہوتی ہے

حالِ دل اس کو سناتا ہے زبانِ شعر میں
حشر لکھی ہے غزل اظہارِ حسرت کے لیے

یہ میری شاعری اے حشر شرحِ دردِ الفت ہے
وہی سمجھیں گے اس کو جو زبانِ دل سمجھتے ہیں

حشر میری شعرگوئی ہے فقط فریادِ شوق
اپنا غم دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں میں

بھری ہو آگ سینے میں تو شعر گرم پیدا ہو
کہ شاعر وہ شجر ہے حشر جلتا ہے تو پھلتا ہے

آغا حشر مندرجہ بالا اشعار میں شعر کے رواں دواں اور سریع التاثیر ہونے، زبانِ دل میں دردِ الفت کی شرح ہونے، شعرگوئی کے فقط فریادِ شوق ہونے، شعر کے اصل لطف کے تخیل و بیان میں پنہاں ہونے، مستی و رنگینی کے باعث غزل کے شبابِ یار کی تصویر ہونے، غزل کے ذریعے اظہارِ حسرت ہونے، شاعر کے سینے کی آگ میں جلنے سے شاعری کے پھلنے پھولنے اور دل سے زبان تک شعلہ زن ہونے والے سوزِ زندگی کے لبِ شاعر پر آکر شعر گرم بن جانے کی روداد اس طرح سناتے ہیں کہ اپنے طرزِ شاعری اور شعری تخلیقی رویے کو روشن کردیتے ہیں۔

آغا حشر کاشمیری کی ادبی شخصیت، شاعری اور ڈرامے کا مرکب ہے۔ اولاً وہ شاعر کی حیثیت سے بساطِ ادب پر وارد ہوئے مگر بعد میں ڈرامے کی طرف ایسے راغب ہوئے کہ ڈرامے ہی کے ہوکر رہ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعری نے اُن کے ڈراموں کو بھی انفرادیت اور فنی وقار سے ہمکنار کیا۔ وہ شعر کہیں یا ڈراما لکھیں مشقِ سخن بہرحال جاری رہتی تھی کیونکہ ان کے ڈراموں کے بیشتر مکالمے منظوم ہوتے تھے یا ان میں اکثر مقامات پر جذبات کے اثرانگیز اظہار کے لیے باضابطہ اشعار کا استعمال ہوتا تھا۔ ان کی شاعری کے مکمل اثاثے پر نظر ڈالیے تو یہ چند باتیں صاف طور پر سامنے آتی ہیں کہ ان کا شعری سرمایہ ان کے ڈراموں کی بہ نسبت بہت کم ہے یا کم دستیاب ہے۔ ان کی بدیہہ گوئی اور قادرالکلامی قابلِ توجہ ہے، وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے انھوں نے دو طویل نظمیں اور بعض دوسری نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان میں اکثر غزل ہی کی ہیئت سے کام لیا گیا ہے۔ یہاں ہم ان کی غزل گوئی تک ہی اپنی گفتگو کو محدود رکھیں گے۔

غزل رمز و ایما کا فن ہے۔ ابتدا میں اس کے موضوعات محدود تھے اور عشقیہ جذبات کے اظہار کی اس میں خاص اہمیت تھی لیکن آج غزل کے موضوعات اور تخلیقی اظہار کے آگے کوئی لکیر نہیں کھینچی جاسکتی۔ آغا حشر کی غزل کو

روایتی غزل کے زمرے میں بہ آسانی رکھا جاسکتا ہے۔ ان کی غزل کے موضوعات و متعلقات وہی ہیں جو غزل کے روایتی شناخت نامے کے طور پر پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ فکر و فلسفہ، رموزِ تصوف اور زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں کے مقابلے میں ان کے یہاں وارداتِ قلبیہ کی عکاسی، حسن کی جلوہ سامانی اور نشاطِ عشق کے بجائے حزنیہ کیفیات اور غمِ عشق کے تجربات کی مصوری کامیابی کے ساتھ ہوئی ہے۔ انھوں نے بطور خاص بصارت کی بصیرتوں اور سماعت کی سحرکاریوں کو کثرت کے ساتھ پردۂ شعر پر مرتسم کیا ہے۔ قلبی واردات کی اس نقش گری میں ان کے یہاں کہیں کہیں نفسیاتی گہرائی بھی ملتی ہے اور وہ اکثر ایک سے زیادہ کیفیات کو ایک شعر میں سمو لیتے ہیں۔ جیسے ان اشعار میں:

سراپا گوش ہو جا باغ میں اے چشمِ نظارہ
لبِ گل سے کتابِ حسن کی تفسیر ہوتی ہے

آیا ہے گل فروشی کو پھر تاجرِ بہار
اے حشر کہہ رہی تھی صبا عندلیب سے

رکا ہے دم فریبِ آرزو مرنے نہیں دیتا
ہلا دے لب، ترا بیمار تیری ایک ہاں تک ہے

ندائے شوق سے گونجی ہوئی ہے عشق کی دنیا
یہاں کا ذرہ ذرہ گفتگوئے یار کرتا ہے

حشر کے زمانے میں عام طور پر جس طرح کی شاعری کا رواج تھا اس میں شستہ، زبان منھ بولتے قافیے، دلچسپ ردیف، خیال اور تجربے کی سادگی تاکہ سامع اسے قبول کرنے میں دقت نہ محسوس کرے، برجستہ محاورے اور موضوع کی تازگی و ندرت کے بجائے زبان کے پُرلطف استعمال کو کہیں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مذکورہ تمام چیزیں فن شاعری کے لیے مفید ثابت نہیں ہوئیں۔ یقیناً اس طرح شعری تجربے کی ادائیگی کے بہت سے ڈھنگ میسر آئے لیکن شعری تخلیقی انفرادیت اور حیات کے روزافزوں تنوع کی عکاسی کے نقوش گہرے نہ ہوسکے۔ حشر کے لیے بھی شعریت کے معنی وہی تھے جو اس وقت کے دیگر عام شعرا سمجھتے تھے۔ اس آبگینے کی حشر کو زیادہ پروانہ تھی جس کو غالب اور اقبال کے یہاں تندیِ صہبا سے پگھلتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے اور جس کے ذریعے بقول سرور صاحب ''شاعر الفاظ کو فتح کرکے لفظ کو زبان اور کائنات بنا دیتا ہے۔'' حشر نے زبان کے بنے بنائے سانچوں کو شکست نہیں کیا لیکن وہ غزل کی زبان کے نبّاض ضرور تھے اور عشقیہ اظہار کے آداب سے بخوبی واقف بھی۔

حشر کی غزل میں رسمِ عاشقی کی جو تہذیب ہے اور جذبے کے اظہار میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ جو بہاؤ ہے وہ دلکشی اور تاثیر ضرور رکھتا ہے۔ ان کا دائرۂ کار محدود سہی لیکن وہ اپنے دائرے میں ناکام نظر نہیں آتے۔ حسن کی مصوری، عشق کی واردات، جذبے کی بیتابی اور ہجر کی حلاوتیں ان کے عشق کے جوہر کو تصویر ضرور کرتی ہیں۔

آغا حشر کی غزل میں یادوں کی نیرنگی، غم و الم کی بہار اور شعری اظہار کی ڈرامائی کیفیات نے جو زاویے بنائے ہیں وہ بہت معنی خیز اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ یاد کا عمل دراصل ماضی یا گزری ہوئی ساعتوں کی تخلیقِ نو سے عبارت ہے۔ یادیں صرف کسی بندھے ٹکے انداز میں ماضی کی عکاسی نہیں کرتیں جس طرح کیمرہ سامنے والے کی من و عن تصویر کھینچ دیتا ہے بلکہ وہ تو پردۂ دید کے اس پار کی بھی سیر کراتی ہیں نیز ایک ایسے دیارِ دیگر کی خبر لاتی ہیں جہاں تک کیمرے کی آنکھ کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ گویا یادوں کی نقش گری کرنے والا شاعر نہ صرف گزرے ہوئے وقت اور دور ہوتی ہوئی ساعتوں میں عصری رنگ بھر کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے بلکہ دھندلی ہوتی ہوئی پرچھائیوں کی تخلیقِ نو کرکے جذبات کی رنگارنگی اور تجربات و مشاہدات کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔ حشر نے یادوں کے حوالے سے کیسی کیسی تصویریں بنائی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

جنوں اٹھے گا جب شوریدگیِ عشق یاد آئی
کوئی صحرا کا ٹکڑا مرقدِ بسمل میں رہنے دے

چٹکیاں لینا، مچل جانا، بگڑنا، روٹھنا
ہائے اک کم سن کی کیا کیا یاد آتی دل میں ہے

گویا تمھاری یاد ہی میرا علاج ہے
رہتا ہے پہروں ذکر تمھارا طبیب سے

ہچکیاں آج چلی آتی ہیں پیہم اے حشر
یاد کرتا ہے مرا زود فراموش مجھے

یادداشتوں کی بنیاد پر نقش ہونے والے تجربات کے ساتھ ہی میں نے حشر کے اشعار کی ڈرامائی کیفیات کا بھی ذکر کیا تھا۔ حشر کی تمثیلی شاعری کے علاوہ ان کی غزل میں بھی حرکی تصویروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حرکت، عمل اور ردِعمل کا ایک سلسلہ ہے جو تغیر و تحرک کا شگفتہ اور مدھم مدھم احساس بھی جگاتا ہے اور ان کی غزل کی ایک الگ جہت کو بھی نمایاں کرتا ہے مثلاً یہ اشعار:

کر رہے تھے غیر سے میری برائی آج وہ
کیا ہی جھینپے، کی جو اک تسلیم جا کے سامنے

سجدے نہیں ہیں ہمدم جھک جھک کے پڑھ رہا ہوں
لکھی ہے میری قسمت اس سنگِ آستاں میں

غصے میں جو دی گالی، منھ چوم لیا میں نے
ظالم نے کہا یہ کیا، میں نے کہا جرمانہ

حشر کی غزل میں غم و الم کے جذبات کی ایک خاص اہمیت ہے۔ وہ دل کی لذت ایذا کو جنس گراں تصور کرتے ہیں اور داغ آرزو کے باقی رہنے پر اصرار کرتے ہیں خواہ دل رہے یا نہ رہے۔ شاعری میں محزونیت اور تہذیب غم کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ یہ وہ خوبی ہے جو شعر میں تاثیر پیدا کرتی ہے اور فنی بلندی بھی عطا کرتی ہے۔ حشر کے غم و الم سے لبریز اشعار میں فنی عظمت ہو نہ ہو لیکن وہ ایک گہرا تاثر ضرور قائم کرتے ہیں:

مٹا دے دل کو دل کی لذتِ ایذا نہ مٹنے دے
ہجومِ کاروانِ شوق اس جنسِ گراں تک ہے
نہ میٹ اے یاس داغِ آرزو اس دل میں رہنے دے
یہ نقدِ غیر رائج گنجِ لا حاصل میں رہنے دے
جراحت زار دل کو چھوڑ کر کیوں غم کہیں جائیں
جب اس ویرانۂ گلشن نما میں دل بہلتا ہے
فغانِ نیم شب سے ہے بہارِ جلوۂ ہستی
کہ ڈھل جاتی ہے ظلمت روح کی جب آنکھ پُرنم ہو

عشقیہ شاعری میں ہوس کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ یقیناً حشر بھی اس راز سے آگاہ تھے۔ ہوس کی آمیزش میر کے یہاں بھی ہے اور غالب کے یہاں یہ رنگ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ راہ تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اگر ایسے اشعار میں جسم کی حرارت کے ساتھ روح کا نغمہ سنائی نہ دے تو بات بننے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں حشر کا صرف ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ہو اجازت تو کلیجے سے لگا لوں رخسار
سینک لوں چوٹیں جگر کی انھی انگاروں سے

حشر کے یہاں اس سلسلے کے ایسے اشعار بھی ہیں جو ذوقی، شامی، اور لمسی حسوں کی سیرابی کا باعث بنتے ہیں۔

مختصر سے اس مضمون میں کیے جانے والے محاکمے میں بہت تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکی لیکن اس گفتگو کی بنیاد پر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ حشر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے صناعی اور بے جا تکلف سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی غزل کو سادگی کے حسن سے مزین کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کی غزل کو عشقیہ شاعری کے معیاروں پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔

حشر بڑے شاعر نہ سہی لیکن پُرکشش، یاد رکھے جانے کے قابل اور اچھے شاعر کہلانے کے مستحق ضرور ہیں۔ آخر میں یہ بھی کہوں گا کہ حشر کے بعض نقادوں نے ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی زور بیان سے کام لیا ہے جس سے حشر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ''تجلیات حشر'' کے صفحات میں مولانا ظفر علی خاں نے یہاں تک لکھ دیا کہ ''تخلیقات کی جدت طرازیاں حشر کو وہاں لے گئیں جہاں ہندوستان کا کوئی شاعر کوئی ڈراما نویس ماضی و حال میں نہیں پہنچا۔ حشر نے شاعری کے جس میدان کو عبور کیا وہ اس دور کے کسی شاعر سے طے نہ ہو سکا۔''

مولانا ظفر علی خاں کی اس رائے کے پیش نظر صرف یہ گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ اس وقت حشر کے بزرگوں میں حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبرالٰہ آبادی، چکبست، عزیز، حسرت، فانی آرزو، جگر، اصغر، ریاض، جوش اختر شیرانی اور یگانہ جیسے شعرا کی ایک پوری صف نظر آتی ہے۔

پتہ:
Deptt. of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi-25

□□□

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے
وجودیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔
ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔
صفحات: 292، قیمت -/114 روپے

زبیر رضوی

دلی کالج مشرقی اور مغربی علوم کا سنگم

میں دلی میں 1952 میں آ کر بس گیا تھا فصیل شہر کے جن دروازوں سے بہت زیادہ میرا گزر ہوتا تھا وہ تھے ترکمان دروازہ اور اجمیری دروازہ۔ 1948 میں تقریباً ایک صدی کے وقفے کے بعد اجمیری دروازے کے عین سامنے دلی کالج نے اپنا تیسرا تدریسی دور شروع کیا تھا۔

میں جب بھی دلی کالج کے پاس سے گزرتا تو میرے حافظے میں اس کے بیتے ہوئے کل کا کوئی ایک ورق اور اس پر لکھے حروف روشن ہو اٹھتے۔ دلی کالج کی عمارت پیچھے چھوٹنے لگتی تو کناٹ پیلیس یا پھر پہاڑ گنج جانے والے راستوں کی جانی پہچانی رونقوں میں روشن حروف تحلیل ہو کر زندگی کی نئی سچائیوں کی طرف اشارہ کر کے حافظے کی سیڑھیوں سے اتر جاتے۔

1971 کی ایک صبح جب دلی کالج کو ہمیشہ کے لیے مرحوم بنانے کی تقریب ہو رہی تھی اور اس کی پیشانی پر ایک نیا نام کندہ کیا جا رہا تھا تو مرحوم دلی کالج کی پوری سوانح میرے حافظے میں کسی بڑھیا کی گٹھری کی طرح اُدھڑ کر کھل گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے حافظے میں کالج کی محفوظ عمارت ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہی ہے اور اس ڈھیر پر ایک لوح لگائی جا رہی ہے جس پر لکھا ہے" یہاں وہ دلی کالج دفن ہے جو مشرق اور مغرب کے جدید وقدیم علوم کا گہوارہ تھا۔" میرے ذہن میں یہ سوال ایک چیخ بن کر گونجتا رہا تھا: کیا دلی کالج کو اس کے اسی نام کے ساتھ آزاد ہندوستان کے تعلیمی افق پر زندہ اور تابندہ نہیں رکھا جا سکتا تھا؟ کسی اور نے نہیں یہ ہم نے ہی کیا کہ ہم نے اپنی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کا ایک ایسا ورق پھاڑ کے ماضی کے طاقچے میں رکھ دیا جس پر ہمارے فکر و خیال کے 181 برسوں کی روداد سفر لکھی تھی۔ اپنے اندر کی توڑ پھوڑ میں مجھے اپنے افسانہ نگار دوست بلراج مین را کی کہانی ''ریپ'' یاد آئی تھی۔

کہانی کا کردار دق کا مریض تھا ہسپتال سے ذرا دوری پر مال تھی جس پر وہ صبح شام ٹہلتا تھا مال اس کی لاعلاج سمجھی جانے والی بیماری سے اسے دھیرے دھیرے دور لے جا رہی تھی۔ ہسپتال میں علاج کی غرض سے اس کے طویل قیام میں مال اس کی رفیق و ہمدم بن گئی تھی۔ وہ جب بھی صبح و شام کے کسی لمحے میں مال کے ہرے بھرے راستے میں قدم رکھتا تو مال اپنے نرم ملائم اور زندگی بخش انگلیوں کے لمس سے اس کے ہاتھوں کو بھر دیتی۔ اس کا نام سعید تھا۔ دق کی بیماری میں مبتلا ایک اور مریض کلدیپ، مال پر سعید کا ہم قدم ہوتا۔ ایک رات جب سعید کلدیپ کے پاس اس کے وارڈ میں آیا تو اس کا رنگ زرد تھا۔ اس نے کلدیپ سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر کہہ نہیں سکا تھا۔ صبح ہوئی تو اس نے سنا کہ اس کے دوست سعید نے شدید ڈپریشن میں خودکشی کر لی۔ کلدیپ کا دل ڈوب گیا۔ وہ جب اگلی شام بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے مال پر گیا تو وہاں اس نے ایک نیا سفید سائن بورڈ لگا دیکھا وہ غش کھا کے گر پڑا۔ نئے سائن بورڈ پر ''دی مال'' کا نیا نام ''گوجرل روڈ'' لکھا ہوا تھا۔

زندگی کی چہل پہل اور اس کی سرگرمیوں کا حصہ بنی تاریخ کو ہم اسی طرح اپنے حافظوں سے کھرچ کر انھیں تاریخ کے مردہ گھروں یعنی عجائب گھروں میں بڑی آرائش اور زیبائش کے ساتھ سجاتے رہے ہیں۔ دلی کالج ہمارے اس سلوک سے بچ سکتا تھا۔ اسے اور کئی صدیوں تک ایک تاریخی درس گاہ کے طور پر اس کے کردار کے ساتھ نہ سہی لیکن نام کے ساتھ تو زندہ رکھا جا سکتا تھا۔ ہمارا سارا رویہ اب رسم سنبھالنے یعنی Ritual کی ادئیگی رہ گیا ہے۔ پرانی دیواروں پر نئے نام کندہ کرنے کو میں نے ہمیشہ تہذیبی جبر کا نام دیا ہے۔ ہماری پارلیمنٹ بھی ہمارے ماضی کے اب نئے نئے نام رکھنے کے عمل کو قانونی تحفظ فراہم کر رہی ہے۔ ہم اگر ایک طرف پٹنہ کو'' پاٹلی پتر'' یا ''عظیم آباد'' کہنے پر اصرار کر رہے ہیں تو دوسری طرف ہم تاریخی ناموں کو کھرچ کر ان کو نئے نام دے رہے ہیں۔ کیا یہ ماضی کو رد کرنا؟ یا پھر حال کی ماضی کے ساتھ کشاکش اور اس کی فتنہ گری تو نہیں ہے؟

1825 میں قائم ہونے والے دلی کالج کی ابتدائی شکل و صورت مدرسہ غازی الدین کی شکل میں سامنے آئی تھی جو دلی والوں کی دنیاوی اور دینوی تعلیم کی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر، 1792 میں قائم ہوا تھا۔ دلی کالج کو جب مشرق اور مغرب کی تعلیم کا نصاب سونپا گیا تو مدرسہ غازی الدین ایک پرچھائیں کی صورت پس منظر میں چلا گیا۔ فرنگی جو انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہندوستان پر اپنے نوآبادیاتی تسلط کے خلاف میرٹھ چھاونی سے اٹھنے والے نافرمانی اور بغاوت کے طوفان سے دہل اٹھے تھے یہ جان چکے تھے کہ دلی کے مقابلے کلکتے کی سیاسی اور سماجی فضا ان کے توسیع پسند وجود کے لیے زیادہ سازگار تھی۔ وہاں راجہ رام موہن رائے جیسے اصلاح پسندوں نے نئے مغربی علوم کے حق میں ایک زبردست تحریک چلائی تھی۔ انگریزی سے ناواقف ہندوستان کو اپنی زبان اور نئے زمانے کی ایجادات اور انسان کو راحت پہنچانے والی سہولتوں کا احساس کرانے کے لیے فرنگیوں نے انگریزی پڑھانے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی عوامی رابطے کی زبانوں کو سیکھنے کی مہم شروع کر دی تھی۔ کلکتے میں فورٹ ولیم کا قیام اسی مہم کی ایک طاقتور کڑی تھی 1857 کی عوامی مزاحمت نے ہندوستانی مسلمانوں کی وفاداری کو فرنگیوں کے تئیں مشکوک اور داغ دار بنا دیا تھا۔ اس مزاحمت کی سزا انگریز نے تیغ زنی اور باغیوں کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈال کر دی تھی تب دلی لہو میں تر بتر ہو گئی تھی۔ اتحاد، انتشار میں بدل گیا اور دلی مکینوں سے خالی ہو گئی۔ اس کے پر رونق اور ہوحق سے بھرے گلی کوچے سناٹوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس افراتفری میں مسلمانوں پر اقتصادی مار تو پڑی ہی ان کی تہذیبی اور مذہبی سرگرمیوں کے مرکز بھی ان کے کنٹرول سے باہر ہو گئے۔ جامع مسجد اور مسجد فتح پوری کی واگذاری ایک مشکل مسئلہ بن گئی۔ اپنے قیام کی تین دہائیوں سے جدید علوم اور سائنس سے مکالمہ کرنے والے دلی کالج میں پڑھائی بند ہو گئی۔ یورپین اساتذہ اور منتظمین اپنی

جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب اس کے درجوں میں طالب علموں اور مغرب سے درآمد ہونے والے نئے علوم کے اسباق پڑھانے والی آوازوں کی جگہ ایک گہری اداسی اور سراسیمگی نے لے لی تھی۔ نافرمانی اور مزاحمت کی تحریک کے زور پکڑنے تک محمد حسین آزاد، نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ، مولوی ضیاء الدین، ماسٹر رام چندر، پیارے لال آشوب، ماسٹر نند کشور دلی کالج سے فیض پاکر اپنے اپنے روایتی معاشرے میں اپنے انحراف اور باغیانہ طرز عمل سے ایک کھلبلی مچا رہے تھے کیونکہ یہ سب انگریزی پڑھنے والے نئے علوم کو ہندوستان کے تعلیمی وژن کا ایک فعال اور جاندار حصہ بنانے پر مصر تھے جبکہ روایتی معاشرہ ان سے چیخ چیخ کر یہ کہہ رہا تھا کہ انگریزی پڑھنے سے مرجانا بہتر ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی شناخت والے ادارے اور افراد تو انگریزی کے شدید خلاف تھے ادھر دلی کالج کے حوالے سے دلی میں ایک ایسی تعلیمی فضا پیدا ہو گئی تھی جسے سی ایف اینڈ ریوز نے نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا۔

کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کے کامیاب تجربے کے بعد دلی کالج کا مغربی علوم کی پڑھائی کا تجربہ دراصل کلکتے والے تجربے ہی کی ایک توسیع تھا اور مستقبل کے علی گڑھ مسلم اینگلو اورینٹل کالج کا نیو کی اینٹ رکھے جانے کا حرف آغاز بھی تھا۔ فرنگی اس حقیقت سے واقف ہو چکا تھا کہ اسے ہندوستان پر اپنے نوآبادیاتی تسلط کی توسیع کے لیے ایک ایسے انتظامی ڈھانچے کی بہرحال ضرورت ہوگی کہ جو انگریز دوست ہو 1857 کی پہلی باغیانہ بیداری کے کس بل نکالنے کے بعد فرنگی کو احساس ہوگیا تھا کہ ہندوستانیوں کی اس کے تسلط کے خلاف مزاحمت ابھی صرف ایک کچی دیوار کی صورت کھڑی ہے جسے چند چوٹوں ہی میں ڈھایا جاسکتا ہے اور ایسا ہی ہوا دلی شہر میں واپس آکر اپنے اپنے گھروں میں دوبارہ بس جانے کی اجازت دینے میں حاکم وقت نے کئی برس لگائے۔ یہ اجازت مسلمانوں کو تو اور بھی دیر سے ملی اور جب 1864 میں دوبارہ دلی کالج کھلا اور اس کے درجوں میں تازہ ہوا کا گزر ہوا تو ایک بار پھر کتاب اور قلم کا رشتہ بحال ہوگیا۔ اس بار دلی کالج میں وہ پہلی سی چہل پہل نہیں رہی۔ دلی والے آہستہ آہستہ دلی کالج کی تعلیمی رونقوں کو بڑھانے میں سرگرم حصہ لینے لگے لیکن نئے علوم کے سلسلے میں اس کا جو ترقی پسندانہ کردار تھا اس کا پھیلاؤ سمٹنے لگا تھا۔ اب نہ کالج کو ڈاکٹر الائس اشپرنگر جیسے جرمن نژاد پرنسپل میسر تھے اور نہ ہی ٹیلر جیسے انگریز پرنسپل، لیکن دلی کالج اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ ایک مثالی درس گاہ بنا ہوا تھا۔

مولوی عبدالحق نے دلی کالج کے ایک ذہنی انقلاب کے نقیب بن جانے کی اہمیت جتاتے ہوئے اس کے امتیازی اوصاف کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام کیا۔ نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کردی جس میں ایسے پختہ کار، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔''

نئے علوم کی روشنی کو عام آدمی تک پہنچانے میں دلی کالج نے یہ بڑا اہم کام بھی کیا کہ اس نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ نئے علوم اور سائنسی مضامین کو بھی اردو ہی میں پڑھایا جاتا تھا۔ ایک اور نمایاں وصف یہ تھا کہ دلی کالج نے ایک ''مجلس ترجمہ'' بھی بنائی تھی۔ اس مجلس کے تحت سو سے زائد ترجمے اور تالیف کے کام ہوئے تھے۔ عام طور سے جامعہ عثمانیہ کے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے اور اس کے دار الترجمہ کی مثال اردو کی لسانی طاقت اور قوت کے ثبوت میں اکثر دی جاتی ہے مگر اس سلسلے میں دلی کالج نے جو خشت اول رکھی تھی اور جس مثالی انداز میں یہاں ترجمے اور درس و تدریس کا کام کیا گیا اس نے انیسویں صدی کے عظیم شاعر غالب کو بھی للچایا تھا۔ وہ دلی کالج کے اساتذہ کی صف میں خود کو شامل کرنے کی غرض سے پالکی میں بیٹھ کر دلی کالج کے باب علم تک آپہنچے تھے۔ اگر کالج کے پرنسپل نے غالب کی پذیرائی دروازے پر آکر کی ہوتی تو دلی کالج کی تاریخ سے اس عہد کا ایک بڑا نام جڑ جاتا اور شاید اس وابستگی سے غالب جیسے جینئس کی زندگی کے اگلے شب و روز ہی بدل جاتے۔

دلی کی یادگار عمارتوں کے تحفظ اور ان کے تاریخی تعارف کے کاموں کی ضرورت کا احساس بھی دلی کالج نے ہی دلایا تھا کہ یہ بنیادی طور پر اپنے قدیم آثاروں اور نوادرات کو محفوظ رکھنے کا وہ جدید سائنسی علم تھا جس سے ہندوستانی نظام تعلیم اور ذہن ناواقف تھا۔ آرکیولوجیکل سوسائٹی کے اراکین میں کچھ ہی انگریز تھے زیادہ تر تو دلی کالج ہی کے فیض یافتہ تھے۔ سرسید احمد خاں، مولوی ضیاء الدین اور ماسٹر رام چندر جیسے صاحب علم اس نئے ادارے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ سرسید احمد خاں اس سلسلے میں زیادہ متحرک تھے، انھوں نے ایک رپورٹ تیار کی تھی جسے آثار قدیمہ والی مجلس کے سامنے پیش کیا گیا۔ سرسید نے اپنی اسی رپورٹ کی روشنی میں ''آثار الصنادید'' لکھ ڈالی اور یوں انھوں نے دلی اور ہندوستان کے طول و عرض میں پہلے قدیم آثاروں پر کام کرنے کی راہ دکھائی تھی۔ گارساں دتاسی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تھا۔ 1837 میں چھپائی کے فن نے ہندوستان میں پرنٹ میڈیا کی رونق دوبالا کردی اور 1867 میں ریل کی چھک چھک والی آواز ہندوستان نے بڑی حیرت سے سنی۔ ان سائنسی ایجادات کی ظہور پذیری کے اس وقفے میں دلی کالج نئے علوم تاریخ، جغرافیہ، اصول قانون، ریاضیات، کیمسٹری، نباتات، معاشیات اور میڈیکل سائنس کے شعبے میں ہندوستان کے ذہن کو نئی نئی معلومات سے بہرہ مند کر رہا تھا۔ انگریز نے کلکتے سے اقتدار کی کرسی جب دلی منتقل کی تو اس وقت تک کمپنی کا زمانہ گزر چکا تھا اور ہندوستان ملکۂ معظمہ کے زیرنگیں آچکا تھا۔ ان کے تاج میں قیصر ہند کا نگینہ بھی جڑ دیا گیا تھا۔ 1877 کے دلی دربار کے موقع پر دلی کالج کو لاہور کالج میں ضم کرنے کا اعلان کردیا گیا۔ یہ دوسری بار ہوا کہ 57 سال کی عمر پانے والے دلی کالج کا باب علم والوں پر بند کردیا گیا۔

پتہ:
7, Cosmo Apts., Street 12, Zakir Nagar,
New Delhi-110025

□□□

ضیاء الرحمٰن غوثی

پھول والوں کی سیر

پھول والوں کی سیر جسے سیر گل فروشاں بھی کہا جاتا ہے، دلی کا ایک رنگا رنگ، پھولوں سے مہکتا تاریخی میلہ ہے۔ یہ سالانہ میلہ دلی والوں کے لیے ایک قیمتی ثقافتی ورثے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے یہ میلہ برسات کے موسم میں بھادوں کے مہینے میں لگتا تھا لیکن اب برسات ختم ہونے پر عموماً وسط اکتوبر میں لگتا ہے۔ میلے کے موقعے پر دلی والے مہرولی میں امنڈ پڑتے ہیں جو دلہن کی طرح سج جاتی ہے۔ خاص طور پر غیر ملکی سیاح اس میلے سے بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں، اس لیے کہ اس موقع پر انھیں قدیم و جدید دلی کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ یہ میلہ مغل حکمرانوں کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق اور ان کی مذہبی رواداری کی نشانی بھی ہے۔

مہرولی میں جہاں ایک طرف مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ مرجع خلائق ہے، وہیں دوسری طرف درگاہ سے تھوڑی ہی دوری پر واقع یوگ مایا جی کا قدیم مندر بھی ہے۔

پھول والوں کی سیر کی تاریخ مغل حکمراں اکبر شاہ ثانی کے زمانے (1806-1837) سے شروع ہوتی ہے جو بے حد دلچسپ ہے۔

بادشاہ اپنے بڑے شاہزادے سراج الدین ظفر (بہادر شاہ ظفر) سے زیادہ خوش نہ تھے اور اپنے دوسرے بیٹے مرزا جہاں گیر کو جو ظفر سے چھوٹے تھے، اپنا ولی عہد بنانا چاہتے تھے لیکن یہ بات لال قلعے میں مقیم انگریز ریزیڈنٹ آرکیبالڈ سیٹن (Archibald Seaton) کو منظور نہ تھی۔ مرزا جہاں گیر مصاحبوں کی خوشامد اور بادشاہ کے لاڈ پیار میں بگڑ گئے تھے اور گستاخیوں کی حد تک بے باک تھے۔ حالانکہ نہایت دلیر اور قوی ہیکل تھے۔ نشانہ بازی اور گھوڑ سواری میں مہارت رکھتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔ مرزا جہاں گیر کو مسٹر سیٹن ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور وہ انھیں اپنی ولی عہدی کے راستے کا کانٹا سمجھتے تھے۔ انھیں نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ اکثر انھیں "لولو" کہا کرتے تھے۔ ایک دن مسٹر سیٹن بادشاہ سے مل کر واپس جا رہے تھے کہ مرزا جہاں گیر نے پیچھے سے پھبتی کسی۔ "لولو ہے بے۔ لولو ہے!" اس پر مرزا کے مصاحبوں نے بھی قہقہہ لگا دیا۔ مسٹر سیٹن نے اپنی خفت مٹانے کے لیے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔ "صاحب عالم کیا کہتے ہیں؟" مصاحبوں نے معاملے کی نزاکت بھانپتے ہوئے کہا کہ صاحب عالم کہتے ہیں: "آپ آبدار موتی کی طرح چمکتے ہیں۔" اس پر مسٹر سیٹن یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ "ہم صاحب عالم کو بھی لولو بنائے گا۔" یہ طنز مرزا جہاں گیر برداشت نہ کر سکے اور ایک دن اپنے طمنچے سے مسٹر سیٹن پر گولی چلا دی لیکن نشانہ چوک گیا اور مسٹر سیٹن بال بال بچ گئے۔ اس وقت کے حالات یہ تھے کہ بادشاہ پر کمپنی سرکار کا کافی دباؤ تھا۔ حکومت بادشاہ کی تھی لیکن حکم انگریزوں کا چلتا تھا۔ بادشاہ اکبر شاہ کو صرف دو لاکھ روپے ماہوار بطور وظیفہ ملا کرتے تھے۔ مسٹر سیٹن نے انتقامی جذبے کے تحت لال قلعے کے دیوان خاص میں سپاہیوں کے ساتھ داخل ہو کر مرزا جہاں گیر کو گرفتار کر لیا۔ بے بس بادشاہ کوئی مدافعت نہ کر سکے۔ مسٹر سیٹن نے بادشاہ کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دیا کہ شہزادے کو حکمرانی کی تربیت کی ضرورت ہے، اس خیال سے تربیت کے لیے انھیں الہ آباد بھیج دیا گیا ہے، تربیت مکمل ہونے پر دہلی واپس بلا لیا جائے گا۔ سچ یہ تھا کہ الہ آباد میں شاہزادے کی حیثیت ایک نظر بند سیاسی قیدی کی تھی۔ عرش تیموری نے اپنی کتاب "قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں" میں شاہزادے کی گرفتاری کے عمل کا ذکر کرتے ہوئے باضابطہ مقابلہ آرائی کی سی کیفیت بیان کی ہے جس میں کافی جانیں تلف ہوئی تھیں۔

مرزا جہاں گیر کی گرفتاری کے صدمے سے ان کی والدہ ملکہ نواب ممتاز محل کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ انھوں نے مہرولی جا کر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دی اور منت مانی کہ شاہزادے کی بخیر و عافیت واپسی پر وہ آستانے پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گی۔ لال قلعے سے شہزادے کی رہائی کی کوششیں جاری رہیں۔ ایک روایت کے مطابق الہ آباد میں رہ کر شاہزادے کے مزاج میں بھی توازن آ گیا تھا۔ حالات ایسے ہوئے کہ خود مسٹر سیٹن کی مداخلت اور سفارش سے ہی مرزا جہاں گیر رہا ہو کر دہلی واپس آ گئے۔ دربار اور رعایا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ملکہ ممتاز محل کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بادشاہ سلامت بھی ملکہ کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔

بیگم ممتاز محل نے اعلان کرایا کہ وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے آستانے پر اپنی منت کی چادر چڑھانے جائیں گی۔ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ منت کی چادر کا جلوس لال قلعے سے روانہ ہوا۔ رعایا بھی جوق در جوق بادشاہ، ملکہ اور شاہزادوں اور شاہزادیوں کے ساتھ چلی۔ ایسی دھوم دھام، ایسی رونق دلی والوں نے بہت مدت سے نہیں دیکھی تھی۔ پھولوں سے بنی منت کی چادر بڑی فنکاری اور خوبصورتی سے تیار کی گئی تھی۔ چادر میں پھولوں سے سجا ایک

پنکھا بھی لٹکا دیا گیا تھا، اس سے اس کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی تھی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے جلوس اور پنکھے کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا، جو پنّی چڑھا، آئینے لگا، پھولوں سے سجا ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا گیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش و محبت اور یگانگت کا نشان تھا جس نے چھوٹے بڑوں، ہندوؤں، مسلمانوں، غربا، امراء، غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقے کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعے سے نکال کر مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا پروانے۔''

جلوس میں خود بادشاہ نے بڑی عقیدت سے اس منت والی چادر کو اپنے سر پر رکھا ہوا تھا جو درگاہ شریف پر بڑی عقیدت اور احترام سے چڑھائی گئی۔ ہندو رعایا نے بادشاہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے قریب ہی واقع یوگ مایا جی کے مندر میں ''چھتر'' اور پنکھے چڑھائے۔ دھوپ اور اگربتی کی خوشبو اور ناقوس کی آواز سے مندر میں سماں بندھ گیا۔ اس طرح 1812 میں بادشاہ اور بیگم ممتاز محل نے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر منت کی پہلی چادر چڑھا کر پھول والوں کی سیر کے میلے کی بنیاد رکھی تھی۔

بادشاہ اکبر شاہ ثانی کو یہ میلہ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اعلان کرادیا کہ اب ہر سال بھادوں کے شروع میں اس دن کی یاد میں ایسا ہی میلہ لگا کرے گا۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کو ساتھ لے کر یوگ مایا جی کے مندر پر پنکھا اور چھتر پیش کریں گے اور ہندو اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ حضرت بختیار کاکیؒ کے آستانے پر پھولوں کی چادر چڑھائیں گے۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں پھول والوں کی سیر کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ یہاں تک کہ 1857 کے پُرآشوب دور میں بھی بہادر شاہ ظفر اس تقریب کو منانے کے لیے تین دنوں تک مہرولی میں قیام پذیر رہے۔

دلی والے آج بھی ساون بھادوں کی جھڑی ختم ہوتے ہی عموماً اکتوبر کے وسط میں ہر سال یہ جشن مناتے ہیں۔ اس موقع پر ہر مذہب و ملت کے لوگ باہم شیر و شکر ہوکر آپسی یگانگت کا بے مثال نمونہ پیش کرتے ہیں۔ گزرے وقتوں کی طرح دلی والے مع اہل و عیال مہرولی پہنچتے ہیں۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار اور یوگ مایا جی کے مندر پر پھولوں کی چادروں اور پنکھوں کے چڑھائے جانے کے مناظر بڑے خوش گوار ہوتے ہیں۔ مہرولی گاؤں، مہرولی کے گلی کوچوں، بازاروں، خاص طور پر جہاز محل اور شمسی تالاب کو پھولوں اور رنگ برنگے قمقموں سے سجایا جاتا ہے۔ جہاز محل کے راستے پر آنے والوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے پھولوں کے کئی گیٹ بنائے جاتے ہیں۔ آتش بازی، تیراکی اور قوالی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ پھول والوں کی سیر کا جلوس عموماً عصر اور مغرب کے درمیان شروع ہوتا ہے۔ جلوس کے آگے آگے چلتے ہوئے سنہری اچکن پہنے شہنائی نواز اور تاشے والے راستے بھر سماں باندھتے جاتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کو اپنی ولی عہدی کے زمانے سے ہی اس میلے میں خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے ''پنکھا'' کے عنوان سے اس میلے پر ایک نظم بھی لکھی تھی جو ان کی کلیات میں شامل ہے۔ اس کے دو بند یہ ہیں:

شائق اس سیر کے سب آج ہیں بادیدہ و دل
واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشمِ انجم ہو نہ اس سیر پہ کیوں کر مائل
میر یہ دیکھے ہے وہ بیگم والا منزل
جس کے ایواں کا، رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک
ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگیں ہے رعیت سے لگا شاہ تلک
زعفراں زار ہے اک بام سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

میلے کی تاریخ کے کئی دن قبل ہی بادشاہ بیگمات، شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھ منہ اندھیرے ہی قطب کے لیے روانہ ہوجاتے تھے۔ صبح سویرے لال قلعے سے روانہ ہوتا اور شام ہوتے ہوتے مہرولی پہنچ جاتا۔ جلوس دہلی دروازہ، پرانا قلعہ، شیر شاہ کی مسجد، ہمایوں کا مقبرہ، بستی حضرت نظام الدین ہوتے ہوئے منصور کے مقبرے (صفدر جنگ کا مقبرہ) پہنچ کر رک جاتا۔ بادشاہ اور ان کے ساتھی خاصہ تناول کرتے، دو ڈھائی گھنٹے آرام کرتے، پھر روانہ ہوجاتے اور شام تک مہرولی پہنچ جاتے۔ وہاں پہنچتے ہی شاہی سواریاں ''جنگلی محل'' کا رخ کرتیں اور جب تک پھول والوں کی سیر کا میلہ رہتا بادشاہ یہیں قیام کرتے۔

تیرھویں تاریخ کو بادشاہی خیمے سے لے کر حضرت قطب صاحب کی درگاہ کے اس مقام تک جہاں بیگمات جاسکتی تھیں، دورویہ قنات کھڑی کرکے پردہ کر دیا جاتا۔ پھولوں کی چادر کی سینی بادشاہ اپنے سر پر، صندل اور عطردان بیگم بیگمات اپنے سروں پر اور شیرینی کے خوان شہزادے اپنے سروں پر اٹھائے آستانے کا رخ کرتے۔ شاہی خاندان کا ہر فرد زرق برق لباس میں ہوتا۔ باجے گاجے آستانے کے باہر روک دیے جاتے۔ بیگمات اور دیگر مستورات فرخ سیر کی بنوائی ہوئی جالیوں تک پہنچ کر رک جاتیں۔ بادشاہ اور درباری مزار شریف پر

جا کر پھولوں کی چادر اور صندل چڑھاتے۔ نقد نذرانہ لنگر کے واسطے جھڑی میں ڈال دیا جاتا۔ شیرینی تقسیم ہوتی۔ اس کے بعد شاہی خاندان خیمے میں لوٹ آتا۔ رات کے کھانے کے بعد ظفر محل میں رقص اور موسیقی کی محفل سجتی۔

چودھویں تاریخ کو مغرب کی نماز کے بعد نفیری کی آواز جھرنے کی طرف سے ابھرتی اور اسی کے ساتھ ابھرتا شان وشوکت کے ساتھ پنکھا۔ تب ہر شخص جھرنے کی طرف چل پڑتا۔ جلوس مہرولی روڈ کی طرف بڑھتا۔ لالٹینوں کی روشنیوں سے رات میں بھی دن جیسا اُجالا ہوجاتا۔ جلوس میں سب سے آگے نگاڑے اور ڈھول ہوتے۔ ان کے بعد ہوتے دو بلند جھنڈے۔ ایک جھنڈے کی بلندی پر ہلال کے نشان والی لالٹین لٹک رہی ہوتی اور دوسرے جھنڈے کی لالٹین سے جھلکتا چکر کا نشان۔ ان کے پیچھے ہوتے مارچ کرتے ہوئے سپاہیوں کے دستے۔ ان کے بعد ہوتا تخت (یعنی چلتا پھرتا لکڑی کا پلیٹ فارم) جس پر موسیقار ایک خوش نما چھوٹے شامیانے کے نیچے بیٹھے ہوتے۔ کہار اس تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوتے۔ اس کے بعد پہلوانوں کی ٹولی ہوتی اور پھر ہوتے مارشل دھن بجاتے انگریزی بینڈ۔ ان کے پیچھے ہوتے سجیلے ترکی گھوڑ سوار۔ ان کے پیچھے دلی کے شرفا اور سب سے آخر میں روایتی پنکھا جس کے آگے آگے شہنائی بج رہی ہوتی۔ اس کے پیچھے بڑی تعداد میں گل فروش ہوتے۔ بالا خانوں سے جلوس پر پھول برسائے جاتے۔ عرق گلاب چھڑکے جاتے اور انعام کے طور پر نقدی اور دوپٹے پھینکے جاتے۔

جلوس آگے بڑھتا جاتا۔ بینڈ اور نفیری والے پسندیدہ دھنیں بجا کر انعام لیتے جاتے۔ جلوس جنگلی محل کے شاہی دروازے تک پہنچ کر باب ظفر کے سامنے کھلے میدان میں ٹھہر جاتا۔ بادشاہ بالکونی سے نظارہ کرتے۔ بیگمات اور خواتین حرم کے لیے پردے کا انتظام ہوتا۔ پہلوانی، تلوار بازی، کرتب بازی، موسیقی، اور رقص کے کمال دکھائے جاتے۔ بہادر شاہ ظفر انعام واکرام کے طور پر کسی کو شال دوشالے اور کسی کو کڑے سے نوازتے جاتے۔ شاہزادے بھی بادشاہ کی اجازت سے جلوس میں شامل ہوتے اور یوگ مایا جی کے مندر میں پنکھا چڑھائے جاتے۔ اس موقع پر مسلمان بھی پیش پیش ہوتے اور پرشاد بھی کھاتے۔ رات کے بارہ بجے پنکھا دیوی کے تخت پر رکھا جاتا۔ پھر لوگ رات گزارنے اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے۔

دوسرے دن اسی جوش وخروش سے درگاہ کا پنکھا لایا جاتا اور شاہی دروازے پر روکا جاتا۔ ہندو مسلمان عقیدت اور جوش وخروش سے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر پنکھا اور چادر چڑھانے جاتے۔ اس موقع پر خاص طور پر ہندو حضرات پیش پیش ہوتے اور عقیدت سے سر جھکائے پنکھے کے ساتھ چلتے۔

بادشاہ اتنے انصاف پسند تھے کہ اگر وہ پنکھے کے ساتھ یوگ مایا کے مندر نہ جا پاتے تو اگلے دن اس خیال سے کہ ہندو رعایا کی دل شکنی نہ ہو، پنکھے کے ساتھ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے آستانے پر بھی نہ جاتے۔ وہ اپنی مسلم و ہندو رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے آستانے پر حاضری کے بعد جلوس کے سب لوگ شمسی تالاب پر پہنچتے جہاں ساری رونق سمٹ آتی تھی۔ کبھی بادشاہ بھی اپنی بیگمات، شہزادوں، شہزادیوں اور درباریوں کے ساتھ وہاں پہنچ جاتے تھے۔ جہاز محل کو خوب سجایا جاتا تھا۔ بیگمات چلمنوں کے پیچھے اپنی اپنی جگہوں پر تشریف فرما ہوتیں۔ بادشاہ اپنی مخصوص شاہی کشتی یا ''مہتابی جہاز'' پر جلوہ افروز ہوتے۔ رات ساڑھے دس بجے کے قریب آتش بازی کا نظارہ قابل دید ہوتا۔ بادشاہ خود آتش بازی کے شوقین تھے۔ آتش بازی سے ایسی روشنی ہوتی گویا رات میں سورج نکل آیا ہو۔

رات کے دو بجے جشن اپنے شباب پر ہوتا۔ پھر بادشاہ اپنے ہاتھوں سے باکمالوں کو انعامات سے نوازتے اور تقریباً تین بجے شب کو جشن اختتام پذیر ہوتا۔ بادشاہ کی سواری علی الصباح مہرولی سے روانہ ہوکر سہ پہر تک لال قلعے پہنچ جاتی۔ عوام مہرولی سے خشک پھل، پرانٹھے وغیرہ بطور یادگار خرید کر اپنے گھر لاتے۔ اس طرح پھول والوں کی سیر کا میلہ ختم ہوجاتا۔

1857 کے پرآشوب زمانے میں بھی بہادر شاہ ظفر پھول والوں کی سیر کے میلے میں شریک ہوئے تھے۔ 1857 کی غارت گری، مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور برطانوی حکومت کے برسر اقتدار آنے پر دہلی کے چند ممتاز شہریوں نواب میرزا الٰہی بخش، حکیم محمود خاں، شہزادہ مرزا سلیمان جاہ، جھنا مل، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ کی دلچسپی سے ڈپٹی کمشنر کے زیر سرپرستی پھول والوں کی سیر کا سلسلہ جاری تو رہا، لیکن میلے میں وہ جوش وخروش اور پہلے جیسا مزہ نہ تھا۔ 1942 کی ''بھارت چھوڑو تحریک'' کے دوران ہماری کئی قیمتی وراثتوں کی طرح سیر گل فروشاں کے میلے پر بھی پابندی عاید کردی گئی اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دلی والے یہ بھول بھی گئے کہ کبھی ایسا میلہ ہوتا تھا۔

ملک آزاد ہوا۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ملک کے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے پھول والوں کی سیر کی اس روایت کی اہمیت کو محسوس کیا۔ 20 برسوں بعد 1961 میں انھوں نے چند ذمہ دار دلی والوں کو بلا کر پھر سے یہ میلہ شروع کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ ان لوگوں میں مرحوم بیرسٹر نورالدین احمد، لالہ شام ناتھ، بیگم تیمور جہاں، جناب یوگیشور دیال، لالہ جگن ناتھ اور دیگر دلّی والے شامل تھے۔ اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے پھر سے نہ صرف اس میلے کی شروعات کرائی بلکہ تقریب میں شامل ہوکر جہاز محل کے پاس میلے میں موجود لوگوں سے خطاب بھی کیا نیز انھیں دلّی کی

پرانی روایتوں کی یاد دلاتے ہوئے بھائی چارے کی تلقین بھی کی۔ تب سے یہ جشن ہر سال انجمن سیر گل فروشاں کے زیر اہتمام پوری باقاعدگی اور اپنی دیرینہ روایتوں کے ساتھ جوش وخروش سے منایا جارہا ہے۔

1961 کے بعد کی پھول والوں کی سیر کی تقریبات کی پھر سے شروعات کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے پیغامات میں کہا تھا:

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ "پھول والوں کی سیر" کے قدیمی روایتی میلے کا سلسلہ دہلی میں پھر سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ ایسا مخصوص نوعیت کا میلہ ہے جس کی ہم سب کو حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ ہماری قومی یک جہتی کا نشان ہے۔ اس کے لیے میری نیک خواہشات ہیں۔" (1962)

"برسوں بعد گذشتہ سال" پھول والوں کی سیر" کے قدیمی روایتی میلے کی پھر سے شروعات ہوئی ہے۔ اس میلے کا جشن دہلی میں سبھی فرقوں کے لوگ مل جل کر منایا کرتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ میلہ پھر اس سال بھی مہرولی میں منعقد ہو رہا ہے۔ ہمارے اتحاد کی علامت ہونے کی بنا پر یہ میلہ ہر طرح کی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ میں اس کے منتظمین کو اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اس قوی امید کے ساتھ کہ اس میلے کے پیچھے جو جذبہ ہے وہ ہمارے ہم وطنوں کو اپنے درمیان بلا امتیاز، ذات، فرقہ اور نسل خوش گوار تعلقات قائم کرنے میں رہنمائی کرے گا۔" (1963)

پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد وزیر اعظم شریمتی گاندھی نے بھی اس میلے میں دلچسپی لی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ پھول والوں کی سیر کا افتتاح ان کی کوٹھی سے ہو چنانچہ اسی سال شہنائی بجا کر میلے کی شروعات کا اعلان ان کی کوٹھی سے ہوا۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بھی اس روایت کو قائم رکھا اور پھول والوں کی سیر کی سرپرستی کی۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب فخرالدین علی احمد، ڈاکٹر شنکر دیال شرما، جناب وینکٹ رمن، جناب نارائنن سوامی اور موجودہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر عبدالکلام نے اس میلے کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔ صدر وینکٹ رمن تو ہر سال جہاز محل آکر پھول والوں کی سیر کی تقریب میں بڑے جوش ومسرت سے شرکت کیا کرتے تھے۔

اب دہلی والوں کے علاوہ مختلف ریاستوں کے شائقین، فنکار اور دیگر معززین بھی اپنی اپنی ریاستوں کے پنکھوں اور دستوں کے ساتھ میلے میں شامل ہوتے ہیں اور حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار اور یوگ مایا جی کے مندر پر حاضری دیتے ہیں۔ بہار، گوا، ہریانہ، کرناٹک، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، پنجاب، راجستھان، تامل ناڈو، ناگالینڈ اور اتر پردیش وغیرہ ریاستیں میلے کے دوران رنگارنگ کلچرل پروگرام پیش کر کے ایوارڈ بھی حاصل کرتی رہی ہیں۔

موجودہ عہدیداران انجمن سیر گل فروشاں

صدر: جناب سلمان خورشید

نائب صدور: جناب آدتیہ آریہ، جناب محمود قمر، جناب وریندر کمار جین، جناب ترون کمار، جناب لیش دیو گپتا، جناب محمد ہارون چیتل والے، جناب محمد شمیم، جناب روپ سینی،

سکریٹری: کرنل سریش چند ایڈیشنل سکریٹری: محترمہ رتنا کمار

جوائنٹ سکریٹری: جناب ونود شرما خزانچی: مرزا محترم بخت عالی

پتہ:
k-94, Abul Fazal Enclave I,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

□□□

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

"بحر الفصاحت" نظم ونثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

جبار علی رضوان انصاری

بہادر شاہ ظفر اور 1857

بہادر شاہ کے مقدمے کی روداد میں احسن اللہ خاں کے بیان کے تحت یہ جملہ بھی ملتا ہے: It was notorious that commander in chief had undertaken upon himself to christianise the whole of India in two years—1851 سے پہلے ہی مقامی لوگ انگریزوں سے متنفر ہو چکے تھے جس کا منطقی نتیجہ 1857 کی بغاوت تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی روداد کچھ ایسا ہی ثابت کرتی ہے اور حسن عسکری، رشید قمبر، سلیمان شکوہ کے پوتے ایڈوکیٹ جنرل نے اس سازش کا مرکز قلعے اور شہر دہلی کو قرار دیا ہے جب کہ وعدہ معاف گواہ حکیم احسن اللہ کے تفصیلی بیان سے ثابت ہے کہ انگریزوں سے متنفر ہونے کے باوجود اور باوجود اس کے کہ بہادر شاہ ہر جنگ کے موقع پر انگریزوں کی شکست کے متمنی رہا کرتے تھے، 11 مئی 1857 سے قبل نہ وہ اور نہ اہل دہلی اس یکا یک پھوٹ پڑنے والی بغاوت سے واقف تھے۔

بہادر شاہ ظفر (پیدائش 14 اکتوبر 1775۔ حکومت 1837 تا 1857۔ وفات 1862) کو آخری مغل بادشاہوں میں بحیثیت انسان کے سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ لال قلعے سے قوی تعلق رکھنے والے ظہیر دہلوی نے انھیں نیک اور پرہیز گار قرار دیا ہے اور انگریزوں تک نے ان کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ "Twilight of the Mughal" کے مصنف اسپیرس (Spears) کا قول ہے کہ وہ آخری مغل شہنشاہوں میں سب سے اچھے تھے۔ اسپیرس کے علاوہ مس مٹکاف کی بیٹی نے بھی اپنی تصنیف "The Golden Calm" میں ان کے اور عیسائیوں کے خلاف ان کے متعلق کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ متعصب بھی نہ تھے دل میں کوئی نفرت نہ تھی۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی انھیں پسند کرتی تھی اور جب بھی ان کے حقوق ولی عہدی کو ان کے والد نے ختم کرنا چاہا آگرے کا لفٹیننٹ گورنر آڑے آیا لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہوگئے جنھوں نے اس مرنجان مرنج اور نیک دل شخص کو بقول Spears ایک سازشی باغی بنا دیا (وہ سازشی تھے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے اور انگریزوں کا سب سے مضبوط گواہ احسن اللہ خاں تک اس سے منکر تھا) بغاوت میں حصہ لینے والے معزول حکمرانوں کے برعکس ماضی قریب میں ان کا یا ان کے خاندان کا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہوا تھا اور مقدمے کے دوران انھیں طعنے بھی دیے گئے کہ انھوں نے اپنے محسنوں (Benefactors) کے خلاف سازش کی لیکن ایک حساس دل رکھنے والا شاعر جس کے پیش نظر اپنے خاندان کی گزشتہ عظمت ہو اپنی بے بسی اور مجبوری کو سمجھتا تو تھا ہی اور اسے اس کا تو احساس تھا ہی کہ لارڈ ایلن برا کے زمانے تک عید، بقرعید، نوروز اور سالگرہ کے مواقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس کی شہنشاہی کے اعتراف کے طور پر جو نذر ملا کرتی تھی وہ بھی بند ہوگئی تھی۔ اس کو اس توہین کا تو احساس تھا ہی کہ باوجود تمام کوشش کے وہ جواں بخت کو ولی عہد نہ بنوا سکا اور مرزا فتح الملک نے انگریزوں سے جوڑ توڑ کر کے اس گری ہوئی شرط پر کہ بادشاہ ہو کر وہ لال قلعہ چھوڑ دیں گے، اپنی ولی عہدی منظور کرالی۔ ان حالات میں اگر وہ کمپنی سے متنفر تھا تو کیا غلط تھا۔ باوجود ظاہری آسائشوں کے، جن کا دارومدار بھی بہت کچھ نذرانوں پر رہ گیا تھا، اس کرب کو اس کا دل محسوس تو کرتا ہی تھا کہ وہ قفس میں اسیر ہے خواہ وہاں اسے کتنی ہی نعمتیں مل رہی ہوں۔ ظفر کے بہت سے اشعار ہیں جن میں استعاراتی انداز اور کنایوں کی شکل میں انھوں نے اپنی دلی کیفیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند پیش خدمت ہیں:

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زادِ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

اے اسیرواب نہ پر میں طاقتِ پرواز ہے
کیا کروگے تم نکل کر دام سے، بیٹھے رہو

نیز ہے جو ہو کے تم سے کہیں کچھ وہ اے ظفر
بولو نہ تم، کہ ان کے ہیں یہ بانکپن کے دن

جیسا کہ Mrs. Henry Duberly نے "Suppression of Mutiny" میں لکھا ہے اس عہد میں دو تین سو روپے میں لوگ جاسوسی کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ قلعے اور پورے شہر دہلی میں نہ صرف جاٹ مل کے پیشہ ور جاسوس موجود تھے بلکہ مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ جیسے لوگ بھی یہ کام انجام دے رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ بادشاہ کی چہیتی بیگم ملکہ زینت محل بھی اپنے بیٹے کی ولی عہدی کی خاطر انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکی تھیں۔ انھی کی وجہ سے بخت خاں کی تمام کوششوں کے باوجود بادشاہ دلّی میں رکے رہے اور آخر خود کو انگریزوں کے حوالے کر دینا پڑا۔ ان جاسوسوں اور منافقوں کی طرف ظفر نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:

ان روزوں اس گلی میں جاسوس جابجا ہیں
کہہ دو کوئی ظفر سے واں آج کل نہ جائے

پھر گا رہے ہیں اگر یہاں جاسوس
بندہ کیا دیکھ کر نہ جائے گا

حقیقت کچھ نہ کچھ اپنی ادھر اڑتی سی پہنچی ہے
کہیں جاسوس کی ان کو خبر اڑتی سی پہنچی ہے

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

کیا یہ آخری شعر حکیم احسن اللہ خاں، مرزا الٰہی بخش اور ملکہ زینت محل کی

طرف اشارہ نہیں کرتا؟

بادشاہ کی بے بسی کا اندازہ کچھ اس شعر سے ہوسکتا ہے:

جو اس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے ہے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

تاج زران کے لیے درد سر ہوگیا تھا
شمع محفل نے کہا رو رو کے شب گلگیر سے
کیا وبال سر مرا یہ تاج زر پیدا ہوا
کہے تھی شب تہ گلگیر شمع رو رو کر
وبال سر پہ مرے تاج زر بنایا تھا

ان کا یہ مشہور شعر ان کے دل کی آواز ہے:

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدا یانہ بنایا ہوتا

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دوسروں پر ظلم کرنے والے خود ان مظلوموں سے بھی ڈرتے رہتے ہیں اور یہی کچھ کیفیت انگریزوں کی تھی:

قفس میں مجھ کو نہ چین آیا پر فغاں سے مری
تمام رات نہ صیاد کو بھی خواب آیا
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی آواز نے سونے نہ دیا

یہ سب اشعار 1857 سے بہت پہلے، جب وہ دیوان اوّل مرتب کر رہے تھے، کہے گئے ہیں لیکن ان سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے وہ حالات کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے اور ان کے دل کی کیا کیفیت تھی۔ ان کے بعض اشعار سے ایسا بھی لگتا ہے جیسے آئندہ ہونے والے مقدمے میں اپنی تذلیل کے مناظر بھی دیکھ رہے تھے۔

نمک چھڑکے ہے وہ کس کس مزے سے دل کے زخموں پر
مزے لیتا ہوں میں کیا کیا، اہا ہا ہا، اہا ہا ہا

جیسا کہ بادشاہ کے سکریٹری کلندر لال نے اپنی گواہی میں کہا، وہ دو سال سے کمپنی سے غیر مطمئن تھے۔ اس کا کچھ ثبوت نہیں کہ انھوں نے میرٹھ سے آنے والے باغیوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔ وہ 11 مئی کی صبح آٹھ بجے تک بغاوت سے بے خبر تھے اور انگریزوں کے جاسوس جاٹ مل اور بہی خواہ احسن اللہ خاں تک نے اپنی گواہیوں میں اقرار کیا ہے کہ وہ بادشاہ اور باغی فوج کے لیڈروں کے درمیان خط و کتابت کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بغاوت کی ابتدائی خبروں کو انھوں نے غیر سنجیدگی سے سنا اور وہ باغیوں سے اس بات پر کہ انھوں نے ان کا سکون درہم برہم کردیا اس حد تک ناراض ہوئے کہ ان کے لیے بدمعاش کا لفظ استعمال کیا اور احسن اللہ خاں کے مشورے سے اسی روز آگرے کے لفٹننٹ گورنر کو خط لکھ کر تمام حالات سے باخبر کیا اور مدد مانگی۔ ساتھ ہی جب انھیں حالات کی نزاکت کا اندازہ ہونے لگا تو انھوں نے باغیوں اور انگریزوں میں ثالثی کی بھی کوشش کی لیکن باغیوں کے دباؤ کے تحت وہ بغاوت کی سربراہی کے لیے آمادہ ہوگئے اور اکیس توپوں کی ان کی سلامی قبول کرلی لیکن بعد کو جب انھیں یہ اندازہ ہوگیا کہ دہلی میں انگریزوں کی حکومت ختم ہوگئی ہے اور انقلاب کامیاب ہو چکا ہے تو عوام کی بھلائی اور امن و امان قائم کرنے کے لیے انھوں نے تمام حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کیا اور احکام صادر کرنے شروع کیے۔ مقدمے میں انھیں باغی اور غدار کہا گیا ہے لیکن اگر ابتدا سے غور کیا جائے تو سوال اٹھتا ہے کہ باغی اور غدار کہلانے کا مستحق کون ہے۔ بادشاہ یا کمپنی؟ ملک پر کمپنی کا قبضہ ہوگیا تھا لیکن خود کمپنی کے عہدہ داروں کے رویے سے ظاہر تھا کہ قلعے کی حدود کے اندر اس وقت بھی بادشاہ مطلق العنان تھا۔ ''جام جہاں نما'' کی ایک خبر سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے موقعے پر ریزیڈنٹ ٹامس مٹکاف قلعے میں آیا، ولی عہد کو تختِ سلطنت پر بٹھایا اور ایک سو ایک اشرفیوں کی نذر پیش کی۔ کیا اس کے بعد بھی انھیں بادشاہ کے بجائے کمپنی کی رعایا سمجھنا چاہیے جیسا کہ مقدمے کے دوران کہا گیا؟ نہ صرف ہندوستانی بلکہ خود بعض انگریز مصنفوں نے لکھا ہے کہ کمپنی کو ان پر مقدمہ چلانے کا حق ہی نہ تھا اس سلسلے میں F.W Buckles نے اپنی کتاب "The political theory of Indian mutiny" میں (جو 1920 میں اشاعت پذیر ہوئی) It was the British East India Company which had rebelled against Bahadur Shah and not Vice-Versa ڈاکٹر این. کے ثم اور دوسرے ہندوستانی مصنفین بادشاہ کو اس بات کا ملزم قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے کیوں مقدمے کی حیثیت کو قبول کرلیا۔ وہ کمپنی کی رعایا نہ 11 مئی 1857 کے پہلے تھے اور نہ یکم اکتوبر کے بعد اس لیے کمپنی کے پاس ان کے خلاف چارج شیٹ جاری کرنے یا مقدمہ چلانے کا کوئی قانونی جواز نہ تھا۔

حقیقت ہے کہ بہادر شاہ نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد بغاوت کی رہنمائی قبول کرلی تھی اور بہت سے وہ کاغذات جو مقدمے میں پیش ہوئے تھے ان کے دفاعی بیان کے اس حصے کی نفی کرتے ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں میں محض قیدی کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے سامنے جو بھی کاغذات پیش کیے جاتے تھے وہ ان پر جان کے خوف سے دستخط کردیتے تھے یا باغی جو کچھ چاہتے تھے وہ لکھ کر ان کی مہر لگا لیتے تھے۔ ان کاغذات میں بہت سے ایسے ہیں جو ان کی بیدار مغزی اور رعایا پروری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے بہت سے احکام وہ ہیں جو انھوں نے مرزا مغل یا دوسرے سرداروں کو رعایا کی فلاح و بہبود اور لٹیروں کے ساتھ سختی سے نپٹنے کے لیے جاری کیے تھے۔ 18 جون 1857 کو مرزا مغل کے نام اپنے ایک حکم نامے میں جو مقدمے کے دوران بطور Exhibit No 13 پیش ہوا انھوں نے کمانڈر ان چیف کو لکھا تھا کہ فوج کا کام حفاظت کرنا ہے نہ کہ لوٹنا اور برباد کرنا۔ لہٰذا فوج کے سردار اپنے سپاہیوں کو ایسی حرکتوں سے باز رکھیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ایک ہی روز قبل پرانے قلعے کے رہنے والوں کی عرضداشت پر مرزا

مغل کو لوٹ مار روکنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس پر فوری عمل نہ ہونے کی وجہ سے مرزا مغل کو دوسرے ہی دن سخت الفاظ میں مخاطب کیا گیا۔ بیاسی سال کی عمر میں اس قسم کے احکام بادشاہ کی بیدار مغزی اور انتظامی صلاحیت کی گواہی دیتے ہیں۔ کچھ احکام وہ ہیں جن میں عوام کی درخواست پر ان کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کی تعیناتی اور گائے کے ذبیحہ پر پابندی کے احکام بھی شامل ہیں۔ ان کے دفاعی بیان کا وہ حصہ صحیح ہے جس میں انھوں نے بغاوت کے ابتدائی دور میں جب انگریزوں کا قتل کیا جارہا تھا باغیوں کے ہاتھوں اپنی بے بسی کا اظہار کیا ہے۔ ایک رحم دل، شریف الطبع، صوفی مشرب اور جذباتیت کی منزل سے گزر جانے والے بوڑھے انسان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کسی بھی گروہ کے، خواہ وہ اس کے دشمنوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو، بچوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم دے۔ کمپنی کے ایجنٹ مسٹر فریزر اور قلعہ دار مسٹر ڈگلس اور دوسرے انگریزوں نیز بچوں اور عورتوں کے قتل کے سلسلے میں خود کمپنی کے جاسوس جاٹ مل، بخت سنگھ چپراسی، غلام عباس اور حکیم احسن اللہ خاں کے بیانات سے ثابت ہے کہ بادشاہ کا نہ تو اس میں ہاتھ تھا اور نہ اسے اس کا علم ہوا۔ شہر سے قلعے میں لائے جانے کے بعد یورپیوں کے قتل کے سلسلے میں جاٹ مل گواہی دیتا ہے کہ سات آٹھ روز کے بعد جب وہ قلعے گیا تو محل کے پہلے صحن میں اس نے یورپیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک باغی سپاہی نے فائر کیا جس سے بادشاہ کا ایک سپاہی مرگیا تب مجمع نے ان یورپیوں کو قتل کردیا۔ اس نے یہ بھی گواہی دی کہ بادشاہ سے قتل کی اجازت لینے کے لیے جب پہلی مرتبہ لوگ گئے تو انھیں اجازت نہیں دی گئی لیکن بعد کو بسنت علی خاں نے لوگوں کے اصرار پر بادشاہ پر یورپیوں کو باغیوں کے حوالے کردیے جانے پر زور دیا۔ اور بادشاہ سے ملنے کے بعد بسنت علی خاں نے دیوان خاص کے پھاٹک پر آکر اعلان کیا کہ بادشاہ نے ان لوگوں کی حوالگی کی اجازت دے دی ہے۔ جاسوس نے یہ بھی گواہی دی کہ اس نے شہر میں سنا کہ بادشاہ یورپیوں کو بچانا چاہتا تھا لیکن فوج کے دباؤ کا مقابلہ نہ کرسکا۔ ایک دوسرے گواہ غلام عباس نے بھی کہا کہ شام کو پانچ چھ بجے کچھ یورپین پکڑے گئے لیکن بادشاہ نے ان کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ تقریباً پندرہ دن کے بعد اسے معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس یورپین مارے گئے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ احسن اللہ خاں سے اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے قتل کرنے سے روکا تھا۔ احسن اللہ خاں کے بیان میں اگرچہ کہا گیا ہے کہ خود اس کے مشورے پر بادشاہ نے پہلے ایسا حکم جاری کرنے سے انکار کردیا لیکن بعد کو سوار فوج کے سردار گلاب شاہ اور پیدل رجمنٹ کے افسروں کی خواہش کے مطابق خواجہ سرا شیدی ناصر خاں اور بسنت علی خاں بادشاہ پر چھا گئے اور بسنت اور شیدی ناصر خاں نے قیدیوں کو گلاب شاہ کے حوالے کردیا اور باغی سپاہیوں نے انھیں تلواروں سے قتل کردیا۔ احسن اللہ خاں کے نزدیک اس قتل عام کے ذمے دار سوار فوج کے رسالدار گلاب شاہ، پیدل رجمنٹ کے افسر، اور بادشاہ کے ملازموں میں شیدی ناصر خاں اور بسنت علی خاں اور شاہزادوں میں مرزا ابوبکر اور مرزا خیر سلطان (حضرت سلطان) شامل تھے۔ ان کے نزدیک بادشاہ اس حد تک ذمہ دار تھے کہ انھوں نے ان قیدیوں کو شاہی حرم میں نہیں چھپایا۔ احسن اللہ خاں کے کردار کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب ظہیر دہلوی نے ان کے سامنے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ قیدی قتل کردیے جائیں گے اور یہ کہ انھیں (احسن اللہ کو) انھیں بچانے کی کوشش کرنی چاہیے تو احسن اللہ ٹال گئے اور ظہیر کو دنیاداری کا یہ سبق پڑھایا کہ ایسے معاملے میں دخل اندازی موت کو دعوت دینا ہوتی ہے لیکن گواہی دیتے وقت وہ اپنی یہ بات بھول گئے۔

مقدمے میں بادشاہ پر چار الزام لگائے گئے تھے:

(1) برٹش گورنمنٹ کے پنشن یافتہ ہونے کے باوجود دس مئی سے یکم اکتوبر تک محمد بخت صوبیدار اور دوسرے افسروں کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دی۔ اس الزام کا بے بنیاد ہونا اس بات سے ثابت ہے کہ محمد بخت خاں یکم جولائی کو دہلی پہنچے جب دہلی انگریزوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ دہلی میں بغاوت کی ابتدا میرٹھ سے آنے والی فوجوں کے ساتھ ہی ساتھ 11 مئی 1857ء کو ہوگئی تھی۔

(2) 10 مئی اور یکم اکتوبر کے دوران بادشاہ نے مرزا مغل کو جو برطانوی رعایا تھے اور دوسرے سپاہیوں اور لوگوں کو حکومت کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ کیا۔ اس الزام اور پہلے الزام میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے صرف بخت خاں کی جگہ مرزا مغل کا نام جاسوسوں اور وعدہ معاف گواہ کے بیان سے ظاہر ہے، ایسی کوئی بات نہ تھی۔ احسن اللہ خاں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ انھوں نے یہ نہیں سنا کہ بادشاہ باغی فوج کے افسروں مرزا مغل اور دوسرے شاہزادے باغی فوج کے دباؤ کے تحت کمانڈر انچیف اور دوسرے افسر بنائے گئے اور وہ بھی بغاوت کی ابتدا کے کئی روز کے بعد جب انگریزوں سے دہلی پوری طرح آزاد ہو چکا تھا اور فوجیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ذمے دار لوگوں کی ضرورت تھی۔

(3) انگریز رعایا ہونے کے باوجود بحیثیت وفادار کے اپنے فرائض کو بھلا کر 11 مئی کو یا اس کے بعد ایک غدار کی حیثیت سے اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا اور غدارانہ طور پر دلّی پر قبضہ کرلیا اور اپنے بیٹے مرزا مغل، صوبیدار محمد بخت خاں اور دوسروں کی مدد سے سرکار برطانیہ کو ختم کرنے کے لیے دہلی میں فوج جمع کی اور اسے انگریزوں سے لڑنے کے لیے بھیجا، یہ الزام بھی غلط ہے۔ خود انگریزوں کی فوج کے کسی بھی Document سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بادشاہ نے خود کوئی فوج جمع کی۔ بقول اسلم پرویز صاحب کے ”کاش انھوں نے ایسا کیا ہوتا“ اور اگر ایسا ہوتا تو حالات کچھ اور ہی ہوتے اور یہ ناکام بغاوت کامیاب انقلاب بن گئی ہوتی۔ بادشاہ اگر واقعی ابتدا سے بغاوت میں شامل ہوتا تو اس کے لیے اس نے کچھ انتظامات بھی کیے ہوتے۔ اس نے تو خود کو باغیوں سے دور رکھنے کے لیے یہاں تک کہا تھا کہ اس کے پاس انھیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جہاں تک بادشاہی کے اعلان کا تعلق ہے، اس اعلان اور تخت نشینی سے کئی روز پہلے ہی کمپنی کا اقتدار پورے طور پر ختم ہوگیا تھا اور مکمل انارکی کا عالم تھا۔ ان حالات میں نئی حکومت کا بننا ضروری تھا۔

چنانچہ نئے سرے سے بادشاہت قائم کرکے بہادر شاہ کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔ کمپنی کسی بھی معاہدے کے تحت دہلی کی قانونی حکمراں نہ تھی اور اس کا یہ دعویٰ غلط تھا کہ بہادر شاہ یا کوئی بھی دہلی والا کسی قانون کے تحت اس کی رعایا تھا جس سے وفاداری کی امید کی جاتی۔ جنگل کے قانون کے مطابق انھوں نے دہلی پر قبضہ کیا تھا اور ویسے ہی وہ وہاں سے نکال دیے گئے تھے اور اہل دہلی نے جائز بادشاہ کی بادشاہت کی تصدیق کی تھی۔ تخت حکومت پر بیٹھنے کا بہادر شاہ کو ویسا ہی حق تھا جیسا ملکۂ الزبتھ کو انگلینڈ کے تخت پر بیٹھنے کا۔

(4) 11 مئی 1857 یا اس کے بعد دلی کے قلعے کی حدود میں انچاس یورپیوں کے قتل میں وہ ملوث تھے اور 10 مئی تا یکم اکتوبر 1857 انھوں نے باغی سپاہیوں کو یورپین افسروں کو ہلاک کرنے کی ترغیب دی اور باغیوں کو انعامات سے نوازا اور دوسرے دیسی حکمرانوں کو انگریزوں اور عیسائیوں کو قتل کرنے کے فرامین بھیجے۔ یورپیوں کے قتل کے متعلق اور بحث کی جا چکی ہے۔ خود انگریزوں کے جاسوسوں اور دوسرے گواہوں کے بیانات بتاتے ہیں کہ انھوں نے انھیں بچانے کی کوشش کی۔ دیسی حکمرانوں سے مدد طلب کرنے کی حقیقت احسن اللہ خاں کے بیان سے کھل جاتی ہے۔ "When the king expected aid from Persia, no effort was made to win over any of the native princes" کاش چند مہینے کی آزادی کے دوران وہ دیسی والیان ریاست میں آزادی کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ان سے مدد حاصل کرتے۔

بہادر شاہ کا مقدمہ ایک رسمی کارروائی تھی جس کا مقصد انگریزوں کی ایمانداری اور انصاف پسندی کا پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ انھیں قتل نہیں کیا جائے گا لیکن ان کی کردار کشی تو ہونا ہی تھی تاکہ ان کے ہم وطنوں کے دلوں سے ان کا وقار ختم ہو جائے اور ان کے دل و دماغ سے ان کے خاندان مغلیہ کا فرد ہونے کے رشتے سے سلطنت کا جائز وارث ہونے کا خیال نکل جائے۔ یہ خیال عوام کے ذہنوں میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ خواہ وہ مرہٹے ہوں یا جاٹ یا روہیلے یا افغان کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ خود تخت شاہی پر بیٹھ جائے اور وہ اپنے کام شاہی خاندان کے ہی کسی فرد کو تخت پر بٹھا کر اور اسے اپنے قابو میں رکھ کر چلایا کرتے تھے۔ انگریزوں کو اسی اعتقاد کو ختم کرنے کے لیے بہادر شاہ ظفر کو سزا دینا تھی۔ انگریزوں کی انصاف پسندی کا پول تو اسی وقت کھل گیا تھا جب شاہی خاندان کے تین افراد مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو دہلی دروازے کے قریب لاکر ہڈسن نے گولی مار دی اور اس کے بعد محض شاہی خاندان کے فرد اور لال قلعے کے مکین ہونے کے جرم میں دوسرے شاہزادوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ کیا انصاف کا تقاضا یہ نہ تھا کہ بہادر شاہ کی طرح ان سب پر مقدمہ چلایا جاتا اور مجرم ثابت ہونے کے بعد ہی ان کو سزا دی جاتی۔ کیا ہڈسن کا قانون اپنے ہاتھ میں لینا جرم نہ تھا، اسے سزا کیوں نہیں دی گئی۔ ان شاہزادوں کے علاوہ سیکڑوں بے گناہوں کو دہلی کی سڑکوں پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ کیا ان پر مقدمے چلا کر یہ معلوم کیا گیا تھا کہ وہ واقعی مجرم تھے؟ بغیر مقدمے چلائے پھانسی دینے کا سلسلہ صرف دہلی، لکھنؤ، کانپور وغیرہ تک محدود نہ تھا۔ مسز ہنری ڈیوبرلی نے اپنی کتاب (Supprssion of Mutiny) میں لکھا ہے کہ دہلی کے سقوط کے بعد جب وہ ممبئی سے شمالی ہند کی طرف آرہی تھیں تو راستے میں انھیں جابجا پھانسی پر لٹکتے ہوئے لوگ نظر آئے۔ بہادر شاہ بیشک جنگ آزادی کے ایک سربراہ ہونے کی حیثیت سے محترم ہیں لیکن محبان وطن کی نظروں میں ان کا مرتبہ اور بلند ہو جاتا اگر وہ ہمت سے کام لے کر مقدمے کو ساقط کرنے سے انکار کر دیتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ اپنے بیٹوں اور پوتوں کی طرح انھیں بھی قتل کر دیا جاتا۔ بیاسی سال کی عمر میں انھیں شہادت کی نعمت بھی میسر آجاتی اور آج وہ ایک مظلوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سرفروش مجاہد کے طور پر یاد کیے جاتے۔

1857 کی تحریک میں ملک کے مختلف طبقوں نے اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے حصہ لیا اور ان میں کسی قسم کا تنظیمی اتحاد نہ تھا اور یہی چیز ناکامی کا باعث بنی۔ بغاوت فوج نے شروع کی تھی لیکن فوج کے علاوہ سابق حکمراں طبقہ، ملازمت پیشہ اور علما سب اس میں شریک ہو گئے تھے لیکن سب کی جدوجہد کے مقاصد جدا جدا تھے۔ بغاوت تین قسم کے لیڈروں کے تحت جاری تھی۔ (1) فوج لیڈر۔ ان میں کوئی خاص فرد رہنمائی کے فرائض انجام نہیں دے رہا تھا بلکہ پنچایتی فیصلوں پر سردار عمل درآمد کرتے تھے۔ ان سرداروں میں لکھنؤ میں موخاں اور دہلی میں بخت خاں پیش پیش تھے۔ (2) عوامی لیڈر۔ یہ اونچے طبقے سے تعلق نہ رکھتے تھے اور ان کے پیش نظر عموماً مذہب کا تحفظ تھا۔ ایسے لیڈروں میں مولوی احمد اللہ شاہ کا نام سرفہرست ہے۔ (3) دیسی سابق حکمراں۔ ان کے پیش نظر ذاتی مفادات تھے اور اس کے لیے وہ فوجیں تیار کرکے جدوجہد کر رہے تھے۔ پہلے دو طبقوں کے لیڈروں کو صاحب وجاہت اشخاص کی تلاش تھی چنانچہ انھوں نے دیسی حکمرانوں کو ان کی مرضی سے یا مرضی کے خلاف اپنے ساتھ لیا جیسا کہ لکھنؤ اور دہلی میں ہوا۔ یہ حضرات جن پر بہ زور ذمہ داری ڈال دی گئی تھی آخر میں بہ رضا و رغبت بغاوت میں حصہ لینے کو تیار ہوئے اور بغاوت کی ناکامی پر سزا کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ یہ تمام گروہ انگریزوں کو ملک سے نکالنا چاہتے تھے لیکن نہ تو ان میں تنظیم تھی اور نہ مقصد کا اتحاد۔ وہ دیسی ریاستیں جن کا براہ راست نقصان نہیں ہوا تھا وہ نہ صرف بغاوت سے الگ بلکہ کچھ حد تک انگریزوں کے ساتھ تھیں۔ حد یہ ہے کہ سکھ جنھیں چند سال قبل ہی انگریزوں کے ہاتھوں بربادی کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ بھی انگریزوں کے ساتھ تھے۔ ان حالات میں بغاوت کا انجام ظاہر تھا۔

پتہ:
120, Gandhi Nagar,
Sudholi, Sitapur
(U.P.)

□□□

بھرت جھن جھن والا

پیٹنٹ دینے میں سختی کی ضرورت

مرکزی سرکار پیٹنٹ قانون میں ترمیم کرنے پر غور کر رہی ہے۔ اس قانون کے تحت ڈرگ کمپنیوں کو نئی دواؤں کو 20 برسوں تک مرضی کے مطابق اونچی قیمت پر بیچنے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ مرکزی سرکار غور کر رہی ہے کہ صرف بنیادی تحقیقات پر پیٹنٹ دیے جائیں۔ معمولی تحقیقات پر یا پرانی دواؤں کے نئے فارمولیشن کو پیٹنٹ نہ دیا جائے۔ جیسے بخار کم کرنے کی دوا پیراسیٹا مول پر پیٹنٹ ختم ہو چکا ہے۔ پیراسیٹامول کی گولی کو میٹھا بنانے کے لیے اس میں چینی ڈال دی جائے تو اسے دوبارہ پیٹنٹ کرایا جا سکتا ہے۔ میٹھے پیراسیٹامول پر پیٹنٹ دینے سے آئندہ 200 برسوں تک اس دوا کو بنانے کی اجارہ داری پیٹنٹ لینے والی کمپنی کو حاصل ہو جائے گی۔ پھیکے پیراسیٹامول کو بنانے کی دوسروں کو چھوٹ رہے گی لیکن اشتہار کے ذریعے کمپنیاں میٹھے پیراسیٹامول کے لیے نیا بازار بنا سکتی ہیں جس پر ان کی اجارہ داری رہے گی۔

عام عقل بھی کہتی ہے کہ پیراسیٹامول میں چینی ڈالنے کو ایجاد نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح کی معمولی ایجادات پر سرکار روک لگانا چاہتی ہے لیکن ڈبلیو ٹی او کے ٹرپس معاہدے میں کہا گیا ہے کہ ہر طرح کی ایجاد کو پیٹنٹ دیا جائے گا، اس لیے سرکار ایسی ترمیم کرنے میں جھجک رہی ہے۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے سرکار نے آر اے ماشیلکر کی سربراہی میں کمیٹی تشکیل دی تھی۔ کمیٹی سے کہا گیا تھا کہ بتائے کہ صرف اصل ایجادات کو پیٹنٹ دینا ٹرپس کے مطابق ہوگا یا نہیں۔

موضوع اہم ہے۔ بڑی ڈرگ کمپنیاں چھوٹی ایجادات کر کے پیٹنٹ کی مدت کو بڑھانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ جیسے مکان کو ہر برس رنگ کر کے نیا بتا دیا جائے۔ اس طرح کا ایک مقدمہ ڈرگ کمپنی نووارٹس کی طرف سے چینئی ہائی کورٹ میں دائر کیا گیا۔ کینسر کی دوا گلیویک پر سرکار نے پیٹنٹ نہیں دیا۔ سرکار کا کہنا ہے کہ گلیویک کے تمام اجزا پہلے ہی سے موجود تھے اور معمولی ترمیم کر کے انھیں پیٹنٹ کے لیے دوبارہ پیش کیا گیا ہے۔

ماشیلکر کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ معمولی ایجادات کو بھی پیٹنٹ دینا چاہیے ورنہ ٹرپس قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ کمیٹی نے دلیل دی کہ ہندوستان میں اس وقت بیشتر ایجادات و تحقیقات اصل نہیں بلکہ معمولی نوعیت کی ہیں۔ اگر معمولی ایجادات کے پیٹنٹ پر پابندی لگا دی جائے تو ہندوستانی کمپنیاں پیچھے رہ جائیں گی۔ جس طرح استاد کا ہیلپر پہلے ٹائر بدلتا ہے اور آہستہ آہستہ اسکوٹر کی مرمت کرنا سیکھ جاتا ہے اس طرح ہندوستانی کمپنیاں بھی اس وقت معمولی ریسرچ کر رہی ہیں اور آہستہ آہستہ بنیادی تحقیقات کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیں گی۔ ماشیلکر کمیٹی نے زیادہ اہمیت دی اور مہنگی دواؤں کے عوام پر پڑنے والے اثرات کو کم طویل مدت میں ہندوستانی کمپنیوں کی ترقی ہو یا نہ ہو لیکن ہندوستان کے عوام پر اس کا فوری منفی اثر ضرور پڑے گا۔

خوش قسمتی سے ماشیلکر کمیٹی کی دلیل کو امریکہ کی سپریم کورٹ نے خارج کر دیا ہے اور فیصلہ دیا ہے کہ پیٹنٹ صرف اصل ریسرچ پر دیا جائے گا۔ امریکی کمپنی ٹیلی فلیکس نے ماضی کی دو ایجادات کو جوڑ دیا۔ بجلی کے ایکسیلیٹر اور پیڈل کو ایک ساتھ گاڑی میں فٹ کر دیا اور ان دو ایجادات کے مشترکہ استعمال کے لیے پیٹنٹ کی درخواست دے دی۔ سپریم کورٹ نے کہا کہ اس ایجاد پر پیٹنٹ نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں بنیادی ریسرچ نہیں ہے۔ اس طرح کے مشترکہ استعمال آسانی سے ہو سکتے ہیں اور انھیں ایجاد نہیں کہا جا سکتا۔ اس فیصلے سے امریکہ کے پیٹنٹ قانون کو دوبارہ لکھا گیا ہے۔ ابھی تک درخواست دہندہ کو صرف یہ دکھانا ہوتا تھا کہ اس نے کسی نئی تکنیک یا چیز کی ایجاد کی ہے۔ نئے پن کی گہرائی سے جانچ ضروری نہیں تھی۔ اگر وہ نیا پن معمول کے عمل میں آسانی سے ہو سکتا تھا تو بھی اسے پیٹنٹ کرایا جا سکتا تھا، جیسے پیراسیٹامول کی گولیوں میں چینی ڈالنا۔ اب سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ نیا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دکھانا ہوگا کہ نیا پن لانے میں درخواست دہندہ کو خصوصی کوششیں کرنی پڑی تھیں اور وہ نیا پن عام حالت میں آسانی سے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ امریکی سپریم کورٹ کے اس فیصلے کا بین الاقوامی اثر ہوگا کیونکہ ڈبلیو ٹی او میں امریکہ با اثر ہے اور دنیا کے بیشتر پیٹنٹ اس ملک کے پاس ہیں۔ بہر حال امریکی سپریم کورٹ کا فیصلہ ماشیلکر کمیٹی کے برعکس اور ہندوستانی عوام کے موافق ہے۔ پیٹنٹ قانون امیر ممالک کی خوشحالی کی بنیاد ہیں۔ جیسے بل گیٹس، ونڈوز سافٹ ویئر پر اجارہ داری کے سہارے دنیا کے امیر ترین شخص بن گئے ہیں۔ اس وقت 90 فیصدی سے زیادہ پیٹنٹ امیر ممالک کے پاس ہیں۔ اپنے پیٹنٹ مال کو ہمیشہ مہنگا بیچ کر وہ زبردست منافع کما رہے ہیں۔ ہمارے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ ہم ان کی بے ایمانی میں شامل ہو جائیں اور اس طرح اپنی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ بھی معمولی سدھار کر کے پیٹنٹ حاصل کریں اور عوام سے اونچی قیمت حاصل کریں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ پیٹنٹ قانون کو ہی بدلنے کی کوشش کریں۔ اگر ٹرپس کے اصولوں کے تحت معمولی سدھار پر بھی پیٹنٹ دینا ضروری ہے تو ٹرپس قانون کو ہی خارج کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں امیر ممالک کے غلط رویوں میں شامل ہو جانے کی بجائے ان کے غلط رویوں کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے سائنس داں بڑی ڈرگ کمپنیوں کو صرف اس لیے بڑھاوا دینا چاہتے ہیں کہ ان کے زیر سایہ ہماری کمپنیوں کو ترقی ملے گی۔ جیسے ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے کوئی نوجوان ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو جائے، بڑی کمپنیوں کے مفادات کی مخالفت کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے۔

امریکہ کے سپریم کورٹ کے فیصلے سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹرپس قانون آخری نہیں ہے۔ اس کی تشریح مختلف طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں ٹرپس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی ایسا ہی لچیلا رخ اپنا کر انھیں عوام کے حق میں موڑنا چاہیے۔ درحقیقت ہمیں پیٹنٹ قانون کو ڈبلیو ٹی او سے باہر نکالنے کی مہم چھیڑنی چاہیے۔ ملک کو ماشیلکر جیسے ماہرین کے محدود نظریے سے گمراہ نہیں ہونا چاہیے۔

پتہ:
Lakshmoli, PO Maletha, Via Kirti Nagar,
Dt Tehri Garhwal, Uttaranchal - 249161

□□□

عتیق الرحمٰن عبدالعظیم

خفقان — اختلاجِ قلب

خفقان کے جملہ اقسام کی تشخیصی علامت یہ ہے کہ اس میں نبض حد سے زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ نبض کا اختلاف عظیم، صغیر، بطی، سریع، متفاوت اور متواتر ہونے میں پایا جاتا ہے۔ اس کے مریض کی نبض اکثر دمہ کے مریض کی نبض سے مشابہ ہوتی ہے۔ معمولی جوش وغصہ یا تیز چلنے یا اونچی جگہ چڑھنے سے دل کا دھڑکنے لگنا، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا جانا اور کبھی بے ہوش ہوجانا وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ اس کے اہم اسباب ہیں سوء ہضم، چائے، شراب اور تمباکو کا بکثرت استعمال، کثرتِ جماع جلق، کثرت محنت دماغی وجسمانی، رنج وغم، نازک مزاجی، کمزوری، بعض اعصابی بیماریاں مثلاً اختناق الرحم، صرع، رعشہ اور جنون بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ لازمی ہے کہ اس طرح کے مریضوں کو رنج وغم اور صدمہ وفکر سے دور رکھا جائے اور بکری کے گوشت کا شوربہ، چپاتی کے ہمراہ کم مرچ ڈال کر پکایا ہوا استعمال کرایا جائے۔ ترکاریوں میں کدو، ترئی، خرفہ، پالک، دالوں میں مونگ، ارہر کی دال، انڈوں کی زردی۔ اس کے علاوہ میوہ جات میں سنگترہ، انگور، ککڑی، کھیرا، ناشپاتی کا استعمال مفید ہے۔ ریاحی وبلغمی میں تیتر اور مرغ وغیرہ کا بھنا ہوا گوشت اور کباب، کوفتہ حسب خواہش استعمال کیا جائے اس سے قطع نظر دریاؤں اور باغوں کی سیر کرنا، خوشبودار پھولوں کا سونگھنا اور عطریات اور خوشبوؤں کا لگانا اور سونگھنا بھی مفید ہے۔ اگر یہ عارضہ معدے کے کسی نقص سے ہو تو یونانی طریقۂ علاج کے تحت حکیم الامت مومن عبدالرحیم ملکاپوری کا یہ نسخہ استعمال کریں جو نہایت مفید ہے۔ عرق بادیان، عرق پودینہ ہر ایک 3 تولہ، عرق الائچی، عرق اجوائن، عرق دارچینی ہر ایک 2 تولہ سب کو ملا کر دو تولہ مصری شامل کر کے پلائیں، اگر ضعفِ قلب یا جسمانی کمزوری اس کا باعث ہو تو عرق کیوڑہ، عرق بیدمشک، گلاب، عرق گاؤزباں، عرق کاسنی، شربت نیلوفر، شربت صندل، شربت انار، شربت انناس، مربائے آنولہ، مربائے سیب، مربائے گاجر، مربائے بہی، خمیرہ مروارید، مفرح یاقوتی، مفرح بارد، دواء المسک بارد وغیرہ میں سے کسی دوا دو یہ کو ملا کر استعمال کریں یا گاجر کو بھوبھل میں بریاں کر کے چھیل لیں اور اندر سے سخت حصہ نکالیں۔ رات کو چھت پر شبنم میں کھلی رکھ دیں۔ صبح قدرے گلاب اور قند ملا کر کھلائیں۔ گرمی کی وجہ سے جو خفقان ہو اس میں پہلے بائیں ہاتھ سے فصد یا سلیق پھر فصد صافن مفید ہے۔ مربائے آملہ دھو کر ورق نقرہ میں لپیٹ کر کھلائیں اور اوپر سے تخم خرفہ، کشنیز خشک، زرشک ہر ایک چھ ماشہ، آلو بخارہ پانچ عدد، گلاب، عرق کیوڑہ، عرق گاؤزباں وعرق صندل میں شیرہ نکال کر شربت انار شیریں شامل کر کے تخم فرنجمشک پانچ ماشہ چھڑک کر پلائیں۔ اور صندل سفید 4 ماشہ، عرق کافور ایک ماشہ قدرے گلاب میں گھس کر سینے کے مقامِ قلب پر لیپ کریں۔ حکیم مومن عبدالرحیم ملکاپوری کے مطابق قلب کے امراض میں زیادہ ٹھنڈی دواؤں کے استعمال میں احتیاط لازم ہے۔ اگر ایسی ضرورت پڑے تو ان میں کچھ گرم و مقوی قلب دوائیں بھی شامل کر لینی چاہئیں۔ مثلاً پارہ مصفّٰی، کبریت مصفّٰی، کشتہ فولاد، کشتہ قلعی ایک تولہ، کشتہ نقرہ دو تولہ اول پارہ اور کبریت کو خوب سحق کر کے کاجل کے مانند سیاہ بنائیں اور بقیہ اشیا میں آمیز کریں اور جوشاندہ پوست بیخ چترہ، رس بھنگرہ و جوشاندہ پوست کھرل کر کے ایک رتی کی گولیاں تیار کریں اور سایے میں خشک کر کے محفوظ رکھیں۔ ایک گولی صبح، ایک شام ہمراہ نیم گرم دودھ (گائے)۔

ہرن یا بارہ سنگھا کا سینگ لے کر اس کو ریتی سے باریک کروالیں اور باریک مٹی کے سکورے میں بھر کر اس کے اوپر مغز گھیکوار ڈالیں۔ سکورے کو بند کر کے خوب مضبوط کپڑ وتی کریں اور گج پٹ کی آگ میں پھونک دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر نکال لیں اور سحق کر کے شیشی میں محفوظ رکھیں۔ 4-2 رتی ہمراہ شیر گائے۔

پارہ و کبریت مساوی وزن لے کر خوب کھرل کر کے کاجل کی مانند بنائیں اور سبز آملوں کے رس، انگور کے رس، اصل السوس کے جوشاندے اور کھجور کے رس میں علیحدہ علیحدہ تین تین روز کھرل کریں اور ایک رتی سے دو رتی تک گولیاں تیار کریں۔ ایک گولی صبح اور ایک گولی شام ہمراہ سبز آملوں کے رس میں مصری ملا کر استعمال کرائیں۔ اس مرض میں استعمال ہونے والی یونانی کی دیگر مشہور ادویات اس طرح ہیں۔

جوارش آملہ سادہ ضعفِ قلب اور اختلاج قلب میں مفید ہے دل، دماغ اور معدے کو طاقت دیتی ہے اور دل وجگر کی بڑھی ہوئی گرمی کو دور کرتی ہے۔ تبخیر کو روکتی اور دستوں کو بند کرتی ہے۔ 10 گرام صبح سویرے نہار منہ کھائیں۔

جوارش آملہ عنبری بہ نسخۂ کلاں دل کی کمزوری اور دھڑکن کو بہت جلد دور کرتی ہے۔ دیگر فائدے جوارش آملہ جیسے ہی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ مفید

اور موثر ہے۔10-5 گرام صبح سویرے نہار منہ کھائیں۔ **جواہر مہرہ** یہ دل کو طاقت دینے اور حرارت عزیزی کو بڑھانے کے لیے طب یونانی کی چوٹی کی دواؤں میں سے ہے۔ عالم نزع میں جب کہ مریض کی حرارت عزیزی گھٹ جائے اور کمزوری بڑھ جائے، اس کا استعمال حیرت انگیز اثر دکھاتا ہے۔60 ملی گرام یا ایک قرص دواء المسک معتدل جواہر والی یا شہد خالص 5 گرام میں ملا کر کھائیں۔**حب جواہر** دل، دماغ اور جگر کو طاقت دیتی ہیں، حرارت عزیزی کی حفاظت کرتی ہیں۔ بیماری سے اچھا ہونے کے بعد کی عام جسمانی کمزوری کو بہت جلد دور کر دیتی ہیں۔ایک گولی صبح سویرے نہار منہ دواء المسک 5 گرام میں رکھ کر کھائیں اور اوپر سے دودھ پئیں۔ **خمیرہ ابریشم سادہ** دل و دماغ کو طاقت دیتا ہے، دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے، آنکھوں کی بینائی کو بڑھاتا ہے۔1 گرام صبح سویرے نہار منہ استعمال کریں۔**خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا** دل کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ دل کی گھبراہٹ اور دھڑکن اور خیالات کی پریشانی کو بہت جلد دور کر دیتا ہے۔ دماغ اور جگر کو بھی طاقت دیتا ہے اور بیماریوں کے بعد کی عام جسمانی کمزوری کو دور کرنے کی مخصوص مقوی دوا ہے۔5 گرام ہمراہ دودھ 250 ملی لیٹر۔**خمیرہ ابریشم شیرہ عناب والا** دل کی کمزوری، دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے۔قوت حافظہ اور قوت بینائی کو بڑھاتا ہے۔سل و دق کی خشک کھانسی کو دور کرتا ہے۔5 گرام صبح سویرے نہار منہ کھائیں۔**خمیرہ صندل** دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے۔10 گرام صبح سویرے نہار منہ کھائیں۔ **دواء المسک معتدل جواہر والی خاص** عام مقوی جسم ہے، دل کی تقویت کے لیے مخصوص ہے، دل کو طاقت دے کر بدن میں دوران خون کو تیز کرتی ہے، دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتی ہے، خون کی پیدائش کو بڑھاتی ہے۔ 5 گرام، صبح کو یا صبح و شام دونوں وقت کھائیں اور اوپر سے دودھ پئیں۔**عرق بید مشک** دل کو طاقت دیتا اور فرحت بخشتا ہے، دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے۔6 ملی لیٹر شربت کیوڑہ 15 ملی لیٹر میں پلائیں۔**شربت کیوڑہ** دل کو قوت و فرحت بخشتا ہے، دل کی گھبراہٹ اور دھڑکن کو دور کرتا ہے، پیاس کو بجھاتا ہے۔50 ملی لٹر ٹھنڈے پانی کے ساتھ پئیں۔**عرق گاؤزبان عنبری بہ نسخۂ کلاں** دل و دماغ کو طاقت دیتا اور فرحت بخشتا ہے، دل کی گھبراہٹ اور دھڑکن کو دور کرتا ہے۔عام جسمانی کمزوری کو دور کرتا ہے۔ 60 ملی لیٹر شربت صندل یا شربت انار 15 ملی لیٹر میں ملا کر پلائیں۔**کشتہ زہر مہرہ** دل کو قوت و فرحت بخشتا ہے۔دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے۔ 125 ملی گرام یا 2 ٹکیاں خمیرہ مروارید 5 گرام میں رکھ کر کھائیں۔**کشتہ یشب** دل کو قوت و فرحت بخشتا ہے، دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے۔ 60 ملی گرام یا 2 ٹکیاں مع خمیرہ مروارید 5 گرام۔**مربہ آملہ** دل کو طاقت دیتا اور فرحت بخشتا ہے۔معدے اور جگر کے لیے بھی مقوی ہے۔ ایک عدد دھوکر نہار منہ ورق نقرہ میں لپیٹ کر کھائیں۔**گلقند سیوتی** دل کو قوت و فرحت بخشتا ہے، دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے۔ 25 گرام چاندی کے ورق میں لپیٹ کر صبح سویرے نہار منھ کھائیں۔**مفرح اعظم** دل کو قوت دیتی اور فرحت بخشتی ہے، دماغ، جگر اور معدے کو طاقت دیتی ہے۔5 گرام صبح یا بعد دوپہر کھائیں۔**مفرح شیخ الرئیس** عام جسمانی کمزوری اور ضعف قلب کو دور کرنے کی عجیب تاثیر رکھتی ہے، دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتی ہے، سل دق اور سوداوی بخاروں میں فائدہ دیتی ہے۔5 گرام تنہا یا کسی عرق یا پانی میں کھائیں۔**مفرح یا قوتی معتدل** یہ اعلیٰ درجے کی مفرح ہے، عام جسمانی کمزوری کو دور کرتی اور دل کو خاص طور پر قوت بخشتی ہے، دل کی دھڑکن اور گھبراہٹ کو دور کرتی ہے۔ دماغ اور جگر کو طاقت دیتی ہے۔5 گرام صبح مع دودھ 250 ملی لٹر لیں۔

پتہ:
21/s/3, Shivaji Nagar Gowandi
West Mumbai- 43 (Maharashtra)

□□□

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس/مترجم: فضل حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نورالدین قریشی

ماحول کے مضرصحت اثرات

اس وقت دنیا کے بڑے اور چھوٹے شہروں کے علاوہ قصبوں اور گاؤں میں لاتعداد پیٹرول، ڈیزل گاڑیوں اور کارخانوں سے خارج ہونے والے کئی اقسام کے زہریلے مواد اور گیسوں کی بہتات ہے۔ جہاں بھی ہوا، پانی کے ذخیروں اور زمین کی وسعتوں میں مضرصحت مادّوں اور گیسوں کی مقدار بہت زیادہ ہو، وہاں لوگوں کی صحت پر بُرے اثرات پڑنا یقینی ہے۔ ان گیسوں کے اثر سے چہرے، آنکھیں اور دیگر بیرونی اعضا کے ساتھ ساتھ اندرونی اعضا بھی مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ماہرین صحت اور سماجی بہبود کے کارکنوں کی آرا سے فائدہ اٹھانے کی اشد ضرورت ہے۔ ماحول میں موجود مضرصحت مادّوں کو زمین کی وسعتوں میں پھیلانے سے ہماری ہوائی وسعتوں میں بھی زہریلی گیسوں کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے لیے ہوا میں پھیلی ہوئی گیسوں کو زائل کرنا الٹراوائلٹ شعاؤں سے خود کو بچانا بہت ضروری ہے۔ اس بارے میں ماہرین ماحولیات نے سیّال اور دیگر اقسام کے زہریلے مادّوں کو تنگ دہانے والے گہرے کنوؤں میں ڈال دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اس قسم کے مادّوں کو اس طرح ٹھکانے لگانے کی ضرورت ہے کہ عوام کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچنے پائے۔

پانی کے ذخیروں میں موجود تمام اقسام کے مضرصحت مادّوں کو ماہرین کی رائے کے مطابق دو طریقوں سے دور کیا جاسکتا ہے۔ جدید قسم کی بڑی لاگت والی اسکیموں کے ذریعے یا قدرتی آسان طریقوں سے۔ جدید ٹیکنالوجی میں اربوں روپے خرچ ہونے کا اندازہ ہے جب کہ قدرتی ترکیبوں سے ماہرین بہت ہی کم لاگت پر پانی کی مضرصحت غلاظتوں کو دور کرسکتے ہیں۔ مثلاً پہاڑیوں اور سطح مرتفع پر دریا کے گندے اور بارشوں کے تیزابی پانی کو مصنوعی تالابوں میں جمع کر کے اس غلیظ پانی کو پتھروں پر ٹکرا ٹکرا کر دوبارہ ایسے ہی تالابوں میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ اس ٹکرائے جانے والے پانی سے بجلی بھی تیار ہوسکتی ہے۔ اب اس کم گندے پانی کو مزید صاف کرنے کی بہترین صورت اس میں ریت ملا کر مفید جڑی بوٹیوں کا استعمال ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جنگلات، ماحولیات اور صحت کے ماہرین ان تمام جگہوں پر ایسے درخت، پیڑ پودے اور جڑی بوٹیاں لگانے کا معقول انتظام کریں جہاں ان کی ضرورت ہو۔ متعلقہ ماہرین کثافت جانتے ہیں کہ ماحول کی کثافت کو کن پیڑ پودوں سے دور کیا جاسکتا ہے، خاص کر ہوا کی مضرصحت گیسوں کو۔ زمین پر ایسے درخت، پیڑ پودے، جڑی بوٹیاں اور گھاس جیسی مفید نباتات موجود ہیں جو مٹی یا پانی کی غلاظتوں اور ہوا کی زہریلی گیسوں کو اپنے اندر جذب کر کے مفید ترین متبادل اجزا مہیا کرتے ہیں۔ وہ اپنی جڑوں، شاخوں اور پتوں کے ذریعے غلیظ ماحول کو صاف ستھرا بناتے رہتے ہیں لیکن یہ تب تک ہی ممکن ہے جب تک مختلف اقسام کی غلاظتیں، اعتدال کی حد میں ہوں۔ یہ تب تک ہی ممکن ہے جب تک مختلف اقسام کی غلاظتیں، اعتدال کی حد میں ہوں۔ جب غلیظ مادّے ہمارے ماحول میں حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو ہم اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرنے کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اس وقت قدرت اپنی منشا کے مطابق ایک ایسی نئی مخلوق کو ہمارے بدلے پیدا کرنے کے لیے آزاد ہے جو فطری قوانین کی اچھی طرح پیروی کرنے کے قابل ہو۔ جنگلات اور زراعت کے ماہرین منصوبہ بند طریقوں سے مناسب جگہوں پر فارم فارسٹری، ہلکسڈ فارسٹری کے پروگرام چلا سکتے ہیں۔ ان اسکیموں کی مدد سے لوگ کھیتوں کی فصلوں، جڑی بوٹیوں یا سیاحوں کی دلچسپی کی آرائشی نباتاتی اقسام لگا سکتے ہیں۔ مختلف قسم کے فارسٹری پروگراموں سے زراعت پیشہ لوگ یا پھل پھول اُگانے والے اپنی فصلوں کو ہوا کے طوفانوں، پانی کے بے وقت سیلابوں، ریت کے طوفانوں اور زمین کے وسیع قطعات کو ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ بڑے چنار، نیم، میوہ دار درخت، پیڑ پودے اور جڑی بوٹیاں لگانا لوگوں کے لیے بہت فائدے مند ہوسکتا ہے۔ وہ ماحول کو خطرناک آلودگی سے بچانے میں بھی کارگر ہیں۔ بعض اقسام کے نباتاتی پودوں سے زرمبادلہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تقریباً 8000 اقسام کے پیڑ پودے، جڑی بوٹیاں آیورویدِ، یونانی، سِدھا اور تبتی طریق علاج میں استعمال ہوتی ہیں۔ ککروندہ، رتن جوت، سکورہ، نیل، ارنڈ، گڑھل، اشوگندھ، برہمی بوٹی، تلسی، کالی تلسی، نیلوفر، دھتورے کی کئی اقسام اس سلسلے میں مشہور ہیں۔ لازم ہے کہ ہم مضرصحت گیسوں، الٹراوائلٹ شعاؤں اور تمام اقسام کے جراثیم وغیرہ سے خود کو بچائے رکھنے کے لیے مناسب قدم اٹھائیں۔ ماسک جیسے پردوں کو گرمی کی شدت اور سردی کے مضر اثرات سے حفاظت کے لیے استعمال کرنا ضروری ہے۔ عرب اپنے چہروں کے بچاؤ کے لیے خاص قسم کا بچاؤ ماسک استعمال کرتے ہیں۔ یہ ماسک نما بچاؤ پردہ، خالص سوتی کپڑے سے بنا ہوا ہوتا ہے تاکہ مختلف مزاج کے لوگوں کو الرجی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس ماسک جیسے بچاؤ پردے میں ماہرین صحت نے منہ، ناک، آنکھوں اور کانوں کے پاس ایسے خانے تیار کیے ہیں جن میں ادویاتی قدروقیمت والے 'مصالحوں کے ست' مناسب صورت میں رکھے گئے ہوں تاکہ استعمال کرنے والے لوگوں کو ماحول کی آلودگی سے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اس ماسک نما بچاؤ پردے کو چہروں پر استعمال کرنے سے بسوں، ٹرینوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرنے والے خود کو مختلف اقسام کے جراثیموں یا وائرس سے بچانے میں کامیاب رہ سکتے ہیں۔ ان ماسک نما 'چہرہ بچاؤ پردوں' میں ایسے مصالحے ہوتے ہیں جنھیں ہم پکائی ہوئی ترکاریوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً پیاز کا ست چہرے کے بچاؤ کے لیے گرمیوں میں کھیرے کے ٹکڑوں کو استعمال کرنے سے ماحول کی آلودگی سے بچا جاسکتا ہے۔ ان دوائیوں میں کچھ ایسے مصالحے بھی ہیں جن کے استعمال سے اینٹی بایوٹک کے مضر اثرات سے بچا جاسکتا ہے۔

پتہ:
New Colony, Battamalva,
Srinagar, Jammu & Kashmir

□□□

اقبال محی الدین

گنگا — ہندوستان کی مقدّس ندی

ہندوستان میں بہت سی ندیاں ہیں جن میں سب سے اہم گنگا ندی ہے۔ یہ جس علاقے سے گزرتی ہے اس کو زراعتی صنعتی اور معاشی اعتبار سے خوشحالی عطا کرتی ہے۔ ہندو مذہبی عقیدے کے مطابق یہ ایک پوتر (पवित्र) دریا ہے۔ ہندو میتھالوجی کے مطابق راجہ بھاگیرتھ نے وشنو بھگوان کی بیحد تپسیا کی کہ ان کی سلطنت میں پانی کی افراط رہے۔ ان کی عبادت سے خوش ہوکر وشنو بھگوان نے ان کو گنگا ندی دینے کا وعدہ کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گنگا کی تیز روی کو وہ سنبھال نہ پائیں گے۔ لہٰذا شنکر بھگوان کو یہ ذمے داری دی گئی کہ وہ اس کی تیزی پر قابو رکھیں اور مناسب مقدار میں اس سرزمین کو پانی دیتے رہیں۔ اس طرح شنکر بھگوان کی جٹاؤں سے گنگا ندی نکلی اور اپنے راستے پر آج تک گامزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اس کو پوتر ندی مانتے ہیں اور ''گنگا میا'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر اس میں اشنان کرتے ہیں۔ ہر بارہ سال کے بعد گنگا کے کنارے کمبھ کا میلہ ایک ہردوار اور دوسرا پریاگ میں لگتا ہے۔ لاکھوں لوگ اس موقعے پر گنگا میں اشنان کرتے ہیں۔ گنگا کے ساتھ دو اہم تہوار بھی جڑے ہیں۔ کارتک پورنیما اور گنگا دسہرہ۔ گرونانک دیو جی کی پیدائش کارتک پورنیما کے دن ہوئی لہٰذا اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ گنگا ندی کو کئی ناموں سے جانا جاتا ہے۔ مثلاً وشنو پدی، جَن ہادی، مندا کنی، بھاگیرتھی وغیرہ۔

گنگا ندی کی بہت سی چھوٹی بڑی معاون ندیاں ہیں جن میں سے کچھ تو ہمالیہ پہاڑ سے نکل کر اس میں ملتی ہیں اور کچھ ندیاں جنوبی سطح مرتفع کے پہاڑی سلسلوں سے نکل کر اس میں مل جاتی ہیں۔ ہمالیہ سے نکلنے والی معاون ندیاں ہیں۔ جمنا، رام گنگا، گومتی، گھاگھرا، کوسی، گنڈک، تیستا اور مہانندہ۔ جنوبی سطح مرتفع کے پہاڑی سلسلوں یعنی وندھیا رینج، اراولی رینج، میکال رینج، کیمور رینج، اور بھان ریر رینج سے نکلنے والی ندیاں ہیں۔ بانس، چمبل، سندھ، بیتوا اور کین جو جمنا ندی کے ساتھ گنگا ندی میں جنوب سے آکر مل جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ میکال کی پہاڑیوں سے نکل کر سون ندی پٹنہ کے پاس گنگا ندی میں مل جاتی ہے۔ اس طرح اپنے منبع (Source) سے لے کر خلیج بنگال کے دہانے تک گنگا اپنے اندر ایک درجن سے بھی زیادہ معاون ندیوں کو سموئے ہوئے بہتی چلی جاتی ہے۔ بنگلہ دیش میں پبنا (Pabna) اور راج باڑی کے نزدیک برہم پترا ندی گنگا سے ملتی ہے، جسے وہاں پدما ندی کے نام سے جانا جاتا ہے، جو آگے چل کر خلیج بنگال میں گر جاتی ہے۔ گنگا ندی کی کل لمبائی 2427 کلومیٹر ہے۔

گنگا ندی ہندوستان کے بڑے شمالی میدانوں کو، جو شمال میں ہمالیہ پہاڑ اور جنوب وندھیا پہاڑیوں تک پھیلے ہوئے ہیں، ایک طرف تو سیراب کرتی ہے دوسری طرف بہت سی ثقافتوں کو پھلنے پھولنے میں مدد کرتی ہے۔ دھارمک مراکز جیسے ہری دوار، پریاگ، کاشی اور کالی گھاٹ، تعلیمی مراکز جیسے دہلی، رڑکی، وارانسی، الٰہ آباد، کلکتہ اور شاہی مراکز جیسے اندرپرستھ، فتح پور سیکری، گوڑ، مرشد آباد اور کلکتہ سب ہی گنگا کی وادی میں پھلے پھولے۔ تاریخ شاہد ہے کہ گنگا ندی اپنے منبع سے لے کر دہانے تک کے لمبے سفر میں اپنے کناروں پر اور میدانی علاقوں میں بڑی بڑی قوموں اور تہذیبوں کو پالتی پوستی رہی ہے۔ جس طرح انسانی زندگی کے تین دور ہوتے ہیں یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ اسی طرح ندیوں کے بھی تین دور ہوتے ہیں۔ پہلا اس کا اوّلین دور یعنی بچپن، دوسرا اس کا درمیانی دور یعنی جوانی اور تیسرا اس کے اخراج کا دور یعنی بڑھاپا۔ گنگا کے طویل سفر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا اپر گنگا بیسن (اتر پردیش)، یعنی اوپری گنگا کا نشیبی میدان، دوسرا مڈل گنگا بیسن (بہار) یعنی وسط گنگا کا نشیبی میدان اور تیسرا لوور گنگا بیسن (بنگال) یعنی گنگا کا نچلا نشیبی میدان۔

اوپری گنگا کا نشیبی میدان (upper Ganga Basin) اتر پردیش اور اترا کھنڈ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی شروعات گنگا کے منبع سے ہوتی ہے۔ یہ اس ندی کے بچپن کا دور ہے۔ گنگا ندی ہمالیہ پہاڑ یعنی گنگوتری گلیشیر کے گئومکھ کے مقام سے نکل کر پہاڑی راستے پر اُچھلتی، کودتی اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی رشی کیش کے مقام سے میدانی حصے میں داخل ہوتی ہے۔ پہاڑی علاقے میں دو اہم ندیاں اس کی معاون ہو جاتی ہیں۔ ایک الک نندہ ہے جو کیدارناتھ کے مقام سے گزرتی ہے اور دوسری مندا کنی جو نندہ دیوی کے مقام سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ ہری دوار کے آگے گنگا میں بہت سی اور ندیوں کی دھارائیں مل جاتی ہیں۔ اس کے داہنے کنارے پر جمنا ندی، پریاگ (الٰہ آباد) کے مقام پر ملتی ہے اور سنگم بناتی ہے۔ پریاگ کی بہت زیادہ مذہبی اہمیت ہے۔ لوگ کمبھ کے میلے کے وقت بھی اور دوسری مذہبی رسومات کو ادا کرنے کے لیے بھی سنگم کے مقام پر گنگا ندی میں نہاتے ہیں اور پوجا کرتے ہیں۔ پریاگ کے پاس سے گزرتے وقت گنگا ندی دوسری مقامی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی دھاراؤں کو اپنے اندر بائیں کنارے سے سمو لیتی ہے۔ پریاگ تک اس کا طاس (Catchment Area) 97,902 مربع کلومیٹر ہے جس میں 100 سے 200 سینٹی میٹر بارش ہوتی ہے۔ طاس اس رقبۂ زمین کو کہتے ہیں جہاں کا پانی بہہ کر دریا میں چلا جائے۔ 60 سے 100 سینٹی میٹر بارش دوآبہ کے علاقے میں ہوتی ہے جو گنگا اور جمنا کا درمیانی حصہ ہے۔

گنگا ندی کی پہلی اہم معاون ندی جمنا ہے جو اس سے الٰہ آباد کے مقام پر ملتی ہے۔ اس کا طاس یا Catchment Area 37,1871 مربع کلومیٹر ہے جس میں اس کے داہنے کنارے پر 40 سے 60 سینٹی میٹر تک اوسطاً بارش ہوتی ہے اور بائیں کنارے پر 60 سے 80 سینٹی میٹر تک اوسطاً بارش ہوتی ہے۔ دو ترقی یافتہ شہر

دہلی اور آگرہ اس کے داہنے کنارے پر آباد ہیں۔گنگا۔ جمنا دوآبہ ایک بہت زرخیز میدانی علاقہ ہے جو ہمالیہ کے دامن تک پھیلا ہوا ہے۔ جمنا ندی کے داہنے کنارے پر مدھیہ پردیش کا کوہستانی علاقہ پھیلا ہوا ہے جس میں چمبل اور بیتوا ندیاں بہتی ہیں جو جمنا کی معاون ندیاں ہیں۔گھاگھرا ندی ہمالیہ پہاڑ سے نکل کر گنگا کے بائیں کنارے پر اس سے چھپرا (بہار) کے مقام پر ملتی ہے۔ پہاڑی دامن اور ندی کے بائیں کنارے تک یہاں اوسطاً بارش 100 سے 200 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ اتنی زیادہ بارش سے اس علاقے میں اکثر سیلاب آجاتا ہے۔گنگا اور گھاگھرا کا دوآبہ ایک زرخیز میدانی علاقہ ہے جس میں کئی مشہور تعلیمی ادارے ہیں۔ اس میں رڑکی، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد اور وارانسی کی مشہور یونیورسٹیاں ہیں۔ یہاں بارش کا اوسط 80 سے 100 سینٹی میٹر تک ہے۔

گنگا۔ جمنا اور گھاگھرا ندیاں ایک دوسرے کے متوازی بہتی ہوئی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف رواں دواں رہتی ہیں اور اپنے ساتھ ہمالیہ پہاڑی اور وندھیا پہاڑیوں کے بڑے بڑے پتھروں اور مٹی کو لے کر بہتی ہیں۔ یہی پتھر جب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ٹوٹ پھوٹ کر بالو اور مٹی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو Alluvium Soil کے نام سے زرخیز میدانی علاقے کی مٹی بن جاتے ہیں۔ یہ Indo-Gangetic Alluvium Tract شمال سے جنوب تک 160 سے 400 کلومیٹر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ لمبائی 650 کلومیٹر تک مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ یہ بہت زیادہ گنجان آباد علاقہ ہے اور ہندوستان کے خوش حال علاقوں میں سے ایک ہے۔

پریاگ شہر جو گنگا اور جمنا کے سنگم پر آباد ہے، اس کا مذہبی کتابوں میں بھی ذکر ہے۔ کاشی شہر بھی گنگا کے کنارے آباد ہے اس کا بھی قدیم ہندو مذہبی کتابوں میں ذکر ہے۔ ان دونوں مقامات کے درمیان گنگا ندی نے اپنے راستے کو سیدھا رکھا ہے مگر چھپرا کے بعد اس کے راستے کی تبدیلی شروع ہوتی ہے جہاں اس سے گھاگھرا ندی ملتی ہے۔

مڈل گنگا بیسن جو بہار ریاست میں پھیلا ہوا ہے، گنگا ندی کے راستے کا دوسرا حصہ ہے جو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چھپرا اور پٹنہ کے درمیان گنگا ندی کے بائیں کنارے سے گھاگھرا ندی اور دائیں کنارے سے سون ندی اس میں ملتی ہے تو گنگا ندی کے راستے میں تھوڑی تبدیلی آتی ہے۔ اسی درمیان گنگا سے گنڈک ندی بھی مل جاتی ہے۔ یہ ندی بھی ہمالیہ کے برفیلے پہاڑوں سے آتی ہے اور گنگا کے پانی میں مل کر اس میں پتھر، مٹی اور ملبے کا اور اضافہ کر دیتی ہے۔ پٹنہ اور منی باری گھاٹ کے درمیان گنگا میں کئی اور چھوٹی چھوٹی ندیاں مل جاتی ہیں جو ہمالیہ کی جنوبی ڈھال سے نکل کر آتی ہیں۔ گنڈک کوسی اور سون ندیاں گنگا میں اتنا پانی بھر دیتی ہیں کہ شمالی بہار میں اکثر سیلاب آجاتا ہے۔ منی ہاری گھاٹ سے جب گنگا بہتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو وہ ''گنگا ڈیلٹا'' میں داخل ہوجاتی ہے جس کے داہنے کنارے پر بھاگیرتھی، ہنگلی اور بائیں کنارے پر پدما اور میگھنا ہیں۔ کوسی ندی کے بعد گنگا میں اس کے بائیں کنارے پر ملنے والی ندی مہانندہ ہے جو بارش کے دوران بھر جاتی ہے۔ وہ بھی اپنا پانی گنگا میں انڈیل دیتی ہے۔ کوسی اور مہانندہ ندیوں کے درمیانی میدان کو ان ہی ندیوں کی نہروں کے ذریعے سینچا جاتا ہے۔

اب ہم گنگا کے تیسرے اور آخری دور کا ذکر کرتے ہیں عام فہم جغرافیائی زبان میں اس کو Lower Gange Basin یا گنگا کا نچلا نشیبی میدان کہا جاتا ہے۔ یہ بنگال کا علاقہ ہے۔ کوسی ندی کے گنگا میں گرنے کے بعد گنگا ندی بنگال کے علاقے میں سست رفتاری سے داخل ہوتی ہے۔ یہ اس کا آخری دور ہے۔ راج محل پہاڑیوں کے دامن سے ہوتی ہوئی یہ ندی بنگال میں آگے بڑھتی ہے۔ اس کے بائیں کنارے پر کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں اس میں آکر مل جاتی ہیں۔ فراخہ کے آگے یہ ندی کئی شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہے جس میں بھاگیرتھی ندی ملتی ہے۔ اس ندی کے ذریعے گنگا اپنا پانی، کنکر اور پتھر اور ملبہ خلیج بنگال میں گرا دیتی ہے۔ گنگا کا داہنا بازو جو پدما ندی کے نام سے جانا جاتا ہے اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ جیسے جلنگی، ماتھا بھنگا، اسچامتی، بھیرپ، تب گنگا اور گوروئی یہ برہم پترا ندی سے مل جاتی ہیں اور بالآخر خلیج بنگال میں گرتی ہیں۔ بہت پرانے زمانے سے ہی بھاگیرتھی۔ ہنگلی اور پدما میگھنا کے درمیان کا ڈیلٹا ''گنگا کا ڈیلٹا'' کہلاتا ہے۔ اس کا رقبہ 58,752 مربع کلومیٹر ہے۔ یہاں کے سندر بن مشہور ہیں۔ اس کے داہنے بازو پر گوڑ، مرشد آباد اور برہام پور ہیں یہ مسلم کلچر کے نمونے تھے۔ کٹوا اور نودیپ بھی پرانے شہر ہیں جو ہندو کلچر کے نمونے تھے۔ کولکاتا بھاگیرتھی اور ہنگلی ندیوں پر آباد ہے جس کا شمار ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔

آج کل گنگا کے پانی میں آلودگی بڑھتی جارہی ہے جس سے کئی طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ شہروں کے نکاس کا گندا پانی اسی دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ بہت سے صنعتی ادارے اپنے بچے ہوئے کیمیائی اجزا کو بھی اسی ندی میں بہا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے پانی میں آلودگی اور گندگی بڑھتی جارہی ہے۔ ہمارے سائنس داں گنگا کے پانی کی صفائی کی جانب دھیان دے رہے ہیں۔ حکومت ہند نے گنگا کی کثافت اور آلودگی سے بچانے کے لیے کئی پروجیکٹ شروع کیے ہیں۔ جن کا مقصد ایک عظیم ندی کی پاکیزگی کو قائم رکھنا ہے۔ دریائے گنگا لاکھوں لوگوں کی زندگی کی شہ رگ ہے۔ یہ ہندوستان کی پرانی تہذیب اور روایات کی امین ہے۔ اور موجودہ دور کی صنعتی اور زراعتی ترقی میں بھی یہ زبردست معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے آبی کثافت اور آلودگی سے بچانا صرف حکومت کی ہی ذمے داری نہیں، ہماری اور آپ کی ذمے داری بھی ہے۔ گنگا کے کنارے اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں جو شہر آباد ہیں وہاں گنگا کے کثیف پانی کی صفائی کا کام حکومت کی طرف سے سنٹرل گنگا اتھارٹی کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ لیکن حکومت کے علاوہ یہ ہمارا بھی فرض ہے کہ جس ندی کو ہم ''ماں'' کا درجہ دیتے ہیں اس کو گندہ ہونے سے بچائیں اور اس کی پاکیزگی کو قائم رکھیں تاکہ ہمیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو گنگا کا تازہ، صاف اور میٹھا پانی ملتا رہے۔

پتہ:
46, Nishat Apartment, Near Shamshad Market,
Aligarh Muslim University, Aligarh-202002

❑❑❑

احسان اللہ احمد

جینیٹک انجینئرنگ سے مٹر کی افزائش

آسٹریا، جس کا صدر مقام ویانا ہے، چیکوسلواکیہ اور جرمنی کے درمیان وسط یورپ کی ایک کم معروف مملکت ہے۔ کسی زمانے میں ہاپس برگ علم اور تہذیب وتمدن کا ایک اہم مرکز تھا۔ اسی ملک کے ایک راہب گریگور جبان مینڈل (Greygor Jaban Mendel) (پیدائش 1822۔ وفات 1884) نے اپنے کلیسا کے باغیچے میں کچھ تجربات کیے۔

اس نے باغیچے میں منتخب چھ تا سات فٹ لمبے اور نوتا اٹھارہ انچ قد کے مٹر کے پودوں سے کچھ بیج حاصل کیے۔ اگلے موسم میں اس نے باغیچے میں ان بیجوں کو بو دیا۔ جب پودے پھولوں سے لد گئے تب ان اونچے پودوں کے پھولوں کی جفتی (Crossing) بونے مٹر کے پودوں سے اپنے ہاتھوں سے کی۔ اس پہلی نسل کے مٹر کے دانوں کو اس نے محفوظ کرلیا اور پھر اس کے بعد کے موسم میں باغیچے میں انھیں بویا اور ان سے دوسری نسل کے بیج حاصل کیے۔ سارے تجربے کے دوران بیجوں کی گنتی اور ان کا حساب کتاب بھی رکھا۔ پھر تیسری بار ان سارے بیجوں کی بوائی کی اور مٹر کے دانے حاصل کیے۔ پھر اپنے سارے تجربے تحریر کیے۔

مینڈل نے اپنے تجربے، ان کے مشاہدات اور پھر ان کے نتائج سے اخذ کیے گئے تاثرات اور اصول وضوابط کو ایک مقالے کی شکل میں لکھا اور 1865 میں آسٹریا کے برن (Brunn) سوسائٹی برائے نیچرل ہسٹری کی میٹنگ میں پڑھا۔ 1866 میں یہ مقالہ اس سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوا لیکن اس مقالے پر حیاتیات کے ماہرین نے توجہ نہیں دی اور مینڈل دل شکستہ ہوکر خاموش ہوگیا۔ یہاں تک کہ 1824 میں اس کی وفات ہوگئی اور اس کے تجربات اور ان سے اخذ کیے ہوئے نتائج پردۂ خفا ہی میں رہے یہاں تک کہ 1900 میں ہیوگوڈی ورائز (Hugo De Vries) (پیدائش 1848۔ وفات 1935) اور ولیم بیٹ سن (William Bateson) (پیدائش 1861۔ وفات 1926) نے اپنے اپنے طور پر مینڈل کے سارے تجربات دہرائے اور وہی نتائج اخذ کیے جو مینڈل نے کیے تھے۔

انگریز ماہر حیاتیات ولیم بیٹ سن نے انگریزی زبان میں ایک کتاب ''مینڈل ازم'' شائع کی اور مینڈل کے تجربوں کی بنیاد پر تحقیق کا کام آگے بڑھایا اور اسے سائنس کے ایک نئے علم کے طور پر متعارف کرایا۔ انھوں نے اس نئے علم کو جینیٹکس (Genetics) اور مینڈل کو فادر آف جینیٹکس سے موسوم کیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف وترجمہ نے اس علم پر غالباً 1940 کی دہائی میں ''مینڈلیت'' کے عنوان سے بیس تیس صفحات کی ایک کتاب شائع کی تھی۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔ اس لیے یہ معلوم نہیں کہ اس کتاب میں جینیٹکس کے لیے کیا اصطلاح استعمال کی گئی مگر اسی دور میں شائع ہونے والی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں اس لفظ کے لیے ''علم تولد وتناسل'' استعمال کیا گیا ہے مگر اس کا مفہوم انگریزی میں لفظ بریڈنگ Breeding ہوتا ہے۔ 1986 میں ترقی اردو بیورو، دہلی کی شائع کردہ ''فرہنگ نباتیات'' میں جینیٹکس کے لیے اصطلاح ''نسلی'' استعمال کی گئی ہے۔ مگر یہ علم اتنا ترقی کرگیا ہے کہ اس کے وسیع کینوس کے لیے اصطلاح ''نسلی'' بھی بہت موزوں نہیں ہے۔ اس لیے عام طور سے جینیٹکس ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ ''جینیٹکس یونانی زبان کے ایک لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں to generate یعنی پیدا کرنا، تخلیق کرنا۔

مٹر کے پودے کی حیات دیگر پودوں کے برخلاف پورا ایک سال ہے۔ اسے آسانی سے کھیتوں، باغیچوں میں اگایا جاسکتا ہے اور ان کی کراسنگ بھی کرائی جاسکتی ہے۔ مٹر کے پھول میں نر اور مادہ حصے الگ الگ اور مکمل حالت میں موجود ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ خود بارور (Self Fertilised) ہوتے ہیں۔ مادہ زواجہ بیضک Ovule اسی پودے کے اسی پھول کے نر زواجہ زیرہ (Pollen) سے بارور ہوتی ہے۔ البتہ اس پودے کے پھول کے دوسرے پودے کے پھول سے باروری کے لیے انسانی ہاتھوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔

مینڈل نے جیسا کہ بتایا جاچکا ہے لمبے اور بونے مٹر کے پودوں سے اپنے باغیچہ میں کچھ بیج حاصل کیے اور انھیں بودیا۔ جب پودے اُگ آئے، ان کے پھولوں پر بہار آئی تب لمبے پودوں کے پھولوں کو بونے پودوں سے کراس کروایا۔ اس جفتی (Cross) سے حاصل ہونے والے مٹر کے دانوں کو اسے F1 نسل کا نام دیا۔ F سے مراد لاطینی لفظ Flial یعنی نسل یا اولاد (Progeny) ہے۔

F1 نسل کے حاصل شدہ مٹر کے دانوں کو دوسرے سیزن میں پھر بویا گیا۔ اس نسل کے بیجوں سے حاصل ہونے والے سارے پودے لمبے تھے، ایک بھی پودا بونا نہ تھا، ان دانوں کو اس نے دوغلی نسل (Hybrid) نام دیا۔ ان سے حاصل ہونے والے دانوں کو اس نے محفوظ کرلیا۔ اگلے سیزن میں ان تمام

ہائی برڈ دانوں کو پھر بو دیا۔ اس سیزن میں اس نے اپنے ہاتھوں سے جفتی سینس کروائی بلکہ تمام پودوں کو خود باروری کا موقع دیا۔ اس سیزن میں حاصل ہونے والے تمام مٹر کے دانوں کو F2 نسل کہا گیا جنھیں اگلے سیزن میں پھر بویا گیا۔ اس F2 نسل میں مٹر کے دانوں کی جملہ تعداد 1064 تھی۔ ان تمام دانوں سے پیدا ہونے والے پودوں میں 787 اونچے پودے تھے اور 277 دانوں نے بونے پودے پیدا کیے۔ اس طرح لمبے اور بونے پودوں میں 1:3 کا تناسب تھا۔ اس نتیجے پر مینڈل اپنے تجربے کا اختتام کرسکتا تھا مگر اسے اپنے مفروضے کی تصدیق کرنی تھی کہ ان مٹر کے دانوں میں ایک مخصوص چیز مخصوص پیٹرن یا ایک عامل ہوتا ہے جو اپنے موروثوں کی خصوصیات (اس تجربے میں لمبائی اور بونا پن) آنے والی نسلوں میں پیدا کرتا ہے۔ اس مخصوص عامل کو بعد میں Gene کا نام دیا گیا۔ اس کا مفروضہ سادے الفاظ میں یہ تھا کہ یہ F2 Gene نسل کے ایک تہائی (1/3) بیج صرف لمبے پودے پیدا کریں گے باقی دو تہائی (2/3) دانوں میں اونچے اور بونے دونوں اقسام کے پودے ہوں گے۔ F2 نسل پودوں کے بونے پودے F3 نسل میں صرف بونے پیدا کریں گے۔ اس کا مفروضہ درست ثابت ہوا۔

مینڈل نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بھی بتایا کہ F1 نسل نے اپنے موروثوں سے لمبے اور بونے دونوں اوصاف یا خصوصیات حاصل کیں مگر اظہار صرف ایک وصف لمبے قد کا کیا۔ وصف کا اظہار نہیں ہوا مگر یہ ان میں پوشیدہ تھا۔ اس کو مینڈل نے غالب خصوصیت (Dominant) اور پوشیدہ وصف کو مغلوب (Recessive) وصف کہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مینڈل نے بتایا کہ ان دانوں میں ایک عامل (Factor) ہوتا ہے جس کی بنا پر ایک خصوصیت غالب آجاتی ہے اور دوسری خصوصیت مغلوب ہوجاتی ہے۔ بعد کی نسلوں میں مغلوب عامل نمایاں ہوجاتا ہے۔ یہ عامل کس طرح عمل کرتا ہے مینڈل اس کی وضاحت نہ کرسکا۔ بعد کے سائنس دانوں نے اس عامل کو جین (Gene) کا نام دیا۔

جین نے F1 نسل میں ایسے موروثوں کی ایک وصف لمبائی (Trait) کو کنٹرول کیا۔ F2 نسل کے دانوں میں ایک تہائی دانوں میں دوسرا وصف، بونا پن، نمایاں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس عامل یا جین نے اس نسل کے دانوں میں اپنی جگہ بدل دی جس کی وجہ سے دوسرا وصف نمایاں ہوا۔

چنانچہ درخت اور پودوں کے بیجوں اور حیوانات اور انسانوں میں نطفہ (Semen) میں جین ایک فیکٹر یا عامل ہوتا ہے جو اپنے موروثوں یعنی نر و مادہ یا مذکر اور مونث کے اوصاف ایک نسل سے دوسری نسل میں پہنچاتا ہے۔ ہر پودے اور جاندار میں جین کی تعداد مخصوص ہوتی ہے اور ان کی جگہ مخصوص ہوتی ہے اور یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ قدرت کی کارفرمائی ہے جو اوصاف (Traits) کی ایک نسل سے دوسری نسل میں پہنچاتی ہے۔ مگر سائنسدانوں نے تحقیق جاری رکھی اور اگلے قدم کے طور پر جین کی تعداد تو برقرار رہنے دی مگر ان کی مخصوص نشست میں تبدیلی کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمزاد (Clone) پیدا کرنے پر قادر ہوگیا۔

جین کی دریافت 1909 میں ہوئی مگر ہم زاد پیدا کرنے کے لیے ریسرچ کا آغاز 1988 میں ہوا۔ تقریباً 80 برسوں کے بعد اس میں کامیابی حاصل ہوسکی۔

حیاتیات کی دونوں شاخیں نباتیات (Botany) اور حیوانیات (Zoology) مینڈل کے وضع کیے ہوئے اصول اور ضابطے استعمال کرنے لگیں۔

پتہ:
49/2RT, Vijay Nagar Colony,
Hyderabad-500057 (A.P.)

□□□

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

مشتاق اعظمی

کرشن چندر سے ایک کالمہ

"ملک کی تقسیم سے پہلے اردو زبان ہندو، سکھ، پنجابی اور کائستھ سب پڑھتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ اردو کو اس وقت گویا نیشنل لینگویج کی حیثیت حاصل تھی لیکن تقسیم کا انتہائی برا اثر اردو پر پڑا۔ آج اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے اور یہ جھوٹ نہیں ہے کہ اردو کو زندہ رکھنا اور اسے فروغ دینا اب صرف مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ کرشن چندر جس نسل میں پیدا ہوا ہے آئندہ اس نسل میں کرشن چندر پیدا نہیں ہوگا۔"

کرشن چندر نے یہ باتیں اس وقت کہیں جب میں نے ان سے ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے متعلق سوال کیا۔ بنگلہ فلم "اُتّر فالگونی" کا جو "ممتا" کے نام سے ہندی میں بن رہی تھی، اس کا اسکرپٹ لکھنے کے لیے کرشن چندر کولکاتا تشریف لائے تھے اور میں وقت لے کر گرانڈ ہوٹل میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔ میرے ہمراہ غلام محمد اختر، کریم رضا مونگیری (اب مدیر روزنامہ "عکاس" کلکتہ) اور سلیم قاسمی بھی تھے۔ کرشن چندر نے گفتگو جاری رکھی۔ "گاندھی جی نے کہا تھا کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی اور یہ اردو، دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی لیکن تقسیم ملک کے ساتھ ہی ان کی یہ بات بھی ختم ہوگئی۔ کچھ دنوں پہلے لندن میں جب میں اپنے چند پاکستانی دوستوں کے درمیان ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا، تو انھوں نے کہا، ہم تو اردو کو اسی دن رو آئے تھے جس دن ملک تقسیم ہوا۔!"

گویا اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کچھ زیادہ پُر امید نہیں ہیں؟

"نہیں، یہ بات نہیں!" کرشن چندر بولے۔ "میں نے حالات سے مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں ہے۔ حالات کس وقت کیا کروٹ بدلتے ہیں، کوئی نہیں جانتا، اس وقت فضا بلاشبہ اردو کے حق میں سازگار نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں اردو کا کوئی اسکوپ نظر نہیں آتا۔ اردو میں ایم۔اے۔ کرنے والوں کو نوکری نہیں ملتی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ فضا بدلے گی ضرور۔ جس زبان کو لوگ دلوں میں جگہ دیتے ہیں وہ کبھی بھی نہیں مرتی۔ ہاں، اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اسے زندہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا اب تنہا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔"

اردو کی اس زبوں حالی کا ذمہ دار آپ کے خیال میں کون ہے؟

کرشن چندر نے کہا۔ "عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت اردو کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کر رہی ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں حکومت ہندی کے ساتھ بھی برائے نام ہی تعاون کر رہی ہے۔ یہ تو ہندی کے سرگرم حامی ہیں جو اس کی ترقی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اس لیے اردو کی زبوں حالی کا سارا الزام حکومت کے سر تھوپ دینا سچائی اور دانش مندی کے خلاف ہوگا۔ اہل اردو تو خود ہی پست ہمتی کا شکار ہیں۔ ان پر شدید بے حسی کی کیفیت طاری ہے۔ اردو کے لیے ان کی ایک بھی مضبوط تنظیم نہیں ہے۔ اہل اردو کے پاس روپے اور ذرائع کی کمی نہیں ہے۔ اربوں روپے رکھنے والے کئی اردو والوں کو تو میں جانتا ہوں جو اردو نوازی کے دعوے دار ہیں مگر ان کی تمام ترنوازشیں بس زبانی جمع خرچ تک محدود ہیں۔ مجھے اردو سے بے پناہ محبت ہے اور آج بھی میرا آدھا وقت اردو کی خدمت میں گزرتا ہے لیکن اردو کی قابل قدر مطبوعات کو خریدنے والے آج کتنے ہیں؟ معیاری ادب پیش کرنے والے پرچے دم کیوں توڑ رہے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب دہ کون ہے؟ حکومت یا اردو طبقہ؟

آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ساری باتیں، میں حکومت کی حمایت میں کر رہا ہوں۔ میں سرکاری آدمی نہیں کہ جا و بے جا طریقے سے حکومت کی طرف داری کروں۔ یہ تلخ حقیقتیں ہیں جن کو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔"

"مداخلت کے لیے معافی چاہوں گا کرشن جی! دراصل اردو داں طبقے کا مزاج سطحیت پسند ہوگیا ہے جس میں کچھ دخل ہندی فلموں کا بھی ہے۔" مقامی شاعر مظفر حیدری (اب یہ بھی مرحوم ہو چکے) جو ہماری گفتگو بہ غور سن رہے تھے، بول پڑے۔ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "پچھلے دنوں ساحر لدھیانوی کلکتہ تشریف لائے اور ایک مشاعرے میں شرکت کی تو سامعین مشاعرہ نے فرمائش کی" ساحر صاحب فلم "پیاسا" کا وہ گیت سنایئے۔
"جانے کیا تو نے کہی۔۔۔۔۔۔!"

"اور ہو سکے تو گیتا دت کی آواز میں سنایئے۔" کرشن نے کمال برجستگی سے فقرے کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد اگلا سوال ہوا۔

اردو زبان و ادب کے لیے آپ کی خدمات توصیف سے بالاتر ہیں۔ افسانوی ادب کو آپ کے قلم نے غیر معمولی مقبولیت عطا کی ہے لیکن یہ تو بتائیں کہ اردو نے بھی آپ کو کچھ دیا یا نہیں؟ ہماری مراد ہے معاشی اعتبار سے۔

کرشن جی نے تکیہ پلنگ کے سرہانے سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ کہنیاں اس پر ٹکا دیں اور چہرہ ہتھیلیوں کے بیچ میں رکھ لیا۔ کہنے لگے "ادب کو وسیلۂ معاش بنا کر کوئی خوش حالی کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ میرے والدین میرے ذوقِ افسانہ نگاری سے نالاں تھے۔ کہتے تھے کہ میں بے روزگاری کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں لیکن مجھے تو عشق تھا اردو سے، افسانہ نگاری سے۔ میں نے اس

کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ مگر میں نے جو کچھ کمایا فلموں سے، ادب سے نہیں۔ ادب ہم سے بہت کچھ لیتا ہے، دیتا نہیں۔ ہاں شہرت اور عزت کی بات الگ ہے لیکن ان چیزوں سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔ لوگ میری تحریروں کی وجہ سے مجھے چاہتے ہیں، میری قدر کرتے ہیں۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے اور یہی میرا انعام ہے۔

اردو کی روزی سے عدم وابستگی کی بات تو شاید ہمارے ہی ملک میں۔۔۔

''نہیں!'' کرشن چندر نے بات کاٹ دی۔ ''دوسرے ممالک کے لکھنے والوں کے بارے میں ہمارے یہاں ایک غلط فہمی عام ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کے لکھنے والے بڑی فارغ البالی کی زندگی گزارتے ہوں گے۔ ایسا نہیں ہے۔ میں بہتیرے بڑے لکھنے والوں سے مل چکا ہوں۔ مجھے انگلینڈ کی اس مشہور اور دولت مند ادب نواز خاتون کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا ہے، جس نے ایک شاندار ہوٹل کھول رکھا ہے۔ اس ہوٹل میں مفلس ادیبوں اور شاعروں کو مفت کھانا ملتا ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کی مفلوک الحالی صرف ہمارے ملک تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کم و بیش صورت حال یہی ہے۔'' کرشن چندر تھوڑی دیر کے لیے رکے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کہنے لگے۔ ''ہمارے یہاں دو یا تین ایسے بڑے ادیب ہیں، جن کو ایک کہانی کا معاوضہ ڈھائی یا تین سو روپے ملا کرتا ہے، اور ایک مہینے میں معیاری کہانی صرف ایک لکھی جاسکتی ہے۔ اب آپ غور کریں کہ اس قلیل رقم میں ایک ادیب اپنا خرچ، بیوی بچوں کے اخراجات اور دیگر ضروری مصارف کیوں کر پورے کرسکتا ہے۔ ہاں، اگر کوئی شخص تنہا ہو یعنی والدین، بھائی بہنوں اور بیوی بچوں کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے سر نہ ہو تو یہ رقم بس ٹھیک ٹھاک ہے۔''

آپ کے معاصر افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو نے غیر معمولی شہرت پائی۔ کچھ بتائیں ان کے بارے میں۔

''میرے اور منٹو کے درمیان بہت سارے نظریاتی اختلافات تھے۔ نظریات میں فرق ہو تو اس کا اثر تعلقات پر بھی پڑتا ہے۔ ویسے منٹو بہت اچھا لکھتا تھا۔ ممبئی میں اس نے پیسے بھی اچھے کمائے۔ کم و بیش اٹھارہ سو روپے ماہوار پیدا کرلیا کرتا تھا۔ لوگ اسے چاہتے بھی بہت زیادہ تھے۔ خصوصاً ممبئی اور اس کے گرد و نواح میں اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی لیکن ''باجو کی گلی سے'' اس کا پاکستان چلا جانا برا ہوا۔ مجھے یاد نہیں، میں اس وقت کہاں تھا لیکن ممبئی میں نہیں تھا۔ ممبئی میں ہوتا تو اسے ہرگز جانے نہ دیتا اور نہ اس کو یہ کہنا پڑتا کہ ''منٹو بھائی، آگے راستہ نہیں ملے گا۔'' لاہور میں منٹو بڑی تنگی کا شکار رہا۔ اس نے ایک دن میں دو دو کہانیاں لکھیں، معاشی ضرورت کے تحت۔ شراب وہ ممبئی میں بھی پیتا تھا لیکن لاہور جاکر کثرت سے پینے لگا۔ شراب نے ہی منٹو کو وقت سے پہلے مار ڈالا۔ میں طبّی نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں۔''

منٹو نام کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ مختلف لوگ اس کا مختلف تلفظ ادا کرتے ہیں؟

''یہ بات تو میں خود بھی نہیں جان سکا کہ صحیح کیا ہے۔'' کرشن چندر نے کہا۔ ''میں اسے چڑانے کے لیے کہا کرتا تھا کہ کیا ہو بھئی! منٹو ہو، مَنٹو یا مُنٹو۔؟ مگر میرا خیال ہے کہ مَنٹو صحیح ہے کیونکہ وہ کشمیری تھا۔''

اس کے بعد اسٹوڈیو سے ان کے بلاوے کا فون آگیا اور ہم لوگوں نے ان سے رخصت چاہی۔ چلنے سے قبل میں نے پوچھ لیا: ''کرشن صاحب فلم ''ممتا'' کا اسکرپٹ آپ نے کس رسم الخط میں لکھا ہے۔ اردو میں یا ہندی میں؟''

جواب میں متبسم ہوکر انھوں نے میز پر سے اسکرپٹ کی ضخیم فائل اٹھائی اور کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی، اسکرپٹ اردو میں تحریر تھا۔ پھر یکا یک کرشن چندر کے چہرے کا تبسم غائب ہوگیا اور اس کی جگہ ماتھے پر گہری سوچ اور اداسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ چند لمحے خاموش رہ کر انھوں نے کہا۔

''دیکھیے یہی وہ زبان ہے جس سے مجھے والہانہ عشق ہے۔ غور سے دیکھ لیجیے۔ شاید پھر یہ رسم الخط دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں۔''

پتہ:
"AZMI MANSION", 25-G.C. Mitra Road,
Kishori Gate, ASANSOL-713301

□□□

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرّہ کی زندگی رسم ورواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت -/216 روپے

شائق احمد یحییٰ

شمالی امریکہ کا سفر

انسانی تہذیب کے بتدریج سفر میں ابن بطوطہ، شاہیانگ، مارکو پولو وغیرہ کا نام سفر کرنے والوں میں سرفہرست ہے۔ انھی مہم جو لوگوں میں سکندر اعظم و ہندوستانی مغل حکمرانوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو ملک وحکومت قبضہ کرنے کے لیے اپنے وطن سے ہجرت کر کے کہیں اور جا بسے۔ انسانی نقل مکانی زیادہ تر نئے موافق حالات اور معاشی ترقی کی جستجو کے نتیجے میں عمل میں آتی ہے جسے انگریزی میں Seeking of greener pasture کہتے ہیں۔ انسان کبھی کبھی کسی قدرتی حادثات جیسے کہ سیلاب، قحط سالی، زلزلہ وغیرہ کے سبب سے بھی نقل مکانی کے لیے مجبور ہوجاتا ہے مگر ایسے حالات زیادہ تر علاقائی ہوتے ہیں۔

گو کہ اس انٹرنیٹ کے دور میں دنیا ایک آفاقی بستی (Global Village) بن گئی ہے، ایک ملک سے دوسرے ملک کی نقل مکانی اب بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ دوسرے ملکوں کی طرح میری کناڈا اور امریکہ کے سفر کی داستان بھی کافی معلوماتی و دلچسپ رہی ہے۔ ویسے تو زندگی بذات خود ایک سفر ہے اور انسان یہاں تمام عمر مسافر، کیونکہ ابدی مسکن تو جنت کا ہی ممکن ہے۔ میں نے اپنے سعودی عرب کے قیام کے دوران کناڈا کے مائیگریشن کے لیے اپلائی کردیا تھا جو کہ امید سے بہت جلد یعنی صرف تیرہ دنوں کے اندر قبول ہوگیا۔ اس طرح مجھے نیشنل کمیشن آف وائلڈ لائف سعودی عرب کی ملازمت سے قبل از وقت ہی علی گڑھ لوٹنا پڑا اور پھر مارچ 1977 میں پوری فیملی کے ساتھ کناڈا آگیا۔ گو کہ شمالی امریکہ کے تحت تقریباً 16 ممالک آتے ہیں، مگر کینیڈا اور متحدہ امریکہ ہی زیادہ مشہور ہیں اور اس سفرنامے میں انھی دونوں ملکوں کی چند جگہوں کا تذکرہ ہے۔

1997 اپریل تا جون Royal Ontario Museum میں والینٹیئر کی حیثیت سے وہاں کے Stuffed پرندوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ ان پرندوں کی ترتیب دینے کے علاوہ ان کے بیشمار Skeleton کا اندراج بھی میری ذمے داریوں میں شامل تھا۔ اس میوزیم میں دنیا کا چوتھا سب سے بڑا پرندوں کا خزانہ (Collection) ہے۔ ٹورنٹو کا قیام کچھ دنوں پرخلوص رشتہ داروں کے ہمراہ رہا پھر چند مہینے کرایے کے فلیٹ میں گزارے۔ بچوں کا وقت ضائع نہ ہو اس لیے انھیں اسکول میں داخلہ دلوادیا گیا اور چونکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میری رخصت ختم ہونے کو تھی۔ میں 11 جولائی 1997 کو علی گڑھ واپس آگیا۔ مائیگریشن حاصل کرنے میں اچھی خاصی رقم صرف ہوئی تھی، مناسب تھا کہ اسے برقرار رکھا جائے۔

جس دن ہم لوگ ٹورنٹو پہنچے تھے یہاں کا درجۂ حرارت منفی 24oC تھا اور ایرپورٹ سے باہر آتے ہی سردی کی شدت کا احساس ہوا۔ ایک دن قبل زبردست برفانی طوفان آیا تھا اور سڑکوں کے کنارے اور میدانوں میں کافی برف جمی ہوئی تھی۔ میں ایسے نظارے اسکاٹ لینڈ میں دیکھ چکا تھا مگر بچے باوجود شدید سردی کے کافی محظوظ ہورہے تھے۔ ٹورنٹو کو بجا طور پر چھوٹا (mini) نیویارک کہا جاتا ہے۔ یہاں کی فلک بوس عمارتیں اکثر شیشے کی چہاردیواری سے گھری ہوتی ہیں۔ وسط شہر میں (جسے Down Town کہتے ہیں) کافی گہماگہمی رہتی ہے۔ سڑکوں پر کاروں کی قطار در قطار، ٹرام بس کے علاوہ زمین دوز ٹرین (Subway) ہزاروں انسانوں کو ادھر سے ادھر منتقل کرتی رہتی ہیں۔ یہاں کی زمین دوز ٹرین نہایت صاف ستھری اور پرسکون ہوتی ہے۔ ممبئی کے لوکل ٹرین سا سماں نہیں ہوتا۔ مسافر بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں کہ امریکہ وکناڈا نقل مکانی کرنے والوں کا ملک ہے۔ لوگوں کے باہمی میل جول، محنت اور لگن سے یہ ممالک بے حد ترقی کرچکے ہیں۔ ٹرین میں کوئی تیز گفتگو نہیں کرتا نہ ہی کسی سے الجھتا اور بحث وتکرار کرتا ہے۔ شدید سردی کے زمانے میں لوگ اونی کپڑوں میں ملبوس بلکہ ان سے ڈھکے رہتے ہیں۔ مگر موسم بہار میں اور گرمیوں میں اسی حساب سے تنگ سے تنگ اور کم سے کم کپڑے پہنتے ہیں بلکہ بہت لوگ تو Topless رہ کر بھی مگن رہتے ہیں۔ مگر جنوبی امریکہ کے بعض ملکوں کی طرح یہاں بوس وکنار اتنے عام نہیں۔ (دیکھیں سفرنامہ چیلی) امریکہ وکناڈا میں عام انسانوں کی مشینی زندگی ہے۔ ہر شخص کو بے حد مشغول رہنا پڑتا ہے تاکہ وقت کو پکڑ سکے۔ بقول شخصے یہاں کے وقت میں کوئی برکت نہیں۔ اگر برصغیر کی طرز زندگی سے موازنہ کریں تو یہاں کی بہتر طرز زندگی کی طرح مشغولیت بھی 40 فیصد زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں ایک فیملی جتنے ذرائع کا استعمال کرتی ہے اتنے اخراجات میں کسی بھی غیر ترقی یافتہ ملک میں 40 فیملی گزارا کرسکتی ہے۔ لہٰذا بہتر زندگی گزارنے کے لیے یہاں کے لوگوں کو بہت مصروف رہنا پڑتا ہے اور اس طرح زندگی میں تناؤ بہت زیادہ

ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں بھی بہت بھاگ دوڑ ہے مگر ادھر کی حالت تو عجیب ہی ہے۔

انسان کے لیے روزی روٹی کا مسئلہ تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا مگر ضروری نہیں ہے کہ تلاش معاش کے لیے ایسی حالت لادلی جائے۔ یہ یہودیوں کے لائے گئے معاشی نظام ہی کا نتیجہ ہے کہ ان جگہوں پر اگر آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو بہت کچھ خرید سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے کریڈٹ سسٹم کہتے ہیں۔ مگر یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ اگر کوئی غلطی سے اس مایا جال میں پھنس گیا تو سود ادا کرتے کرتے حالت خراب ہوجاتی ہے؛ اصل کی تو پوچھیے ہی نہیں۔ کناڈا میں ٹیکس کا بھی بڑا مسئلہ ہے۔ حالانکہ اس نظام سے فلاح عامہ اور حفظان صحت کے کام بسہولت انجام پاتے ہیں مگر ہر طرح کے ٹیکس میں بتدریج اضافے سے ہر شخص پریشان نظر آتا ہے۔ اوپر سے ٹھنڈے موسم کی شدت اور بھی نت نئے مسائل جنم دیتی رہتی ہے اور اکثر لوگ دور کا ڈھول سہانا جیسی مثال دیتے ہیں کہ اپنے دیش میں یہ بات ہے اور وہ بات ہے۔ مگر ترقی پذیر ملکوں کی معاشی، سماجی و سیاسی بدحالیوں کو دیکھ کر شاید ہی کوئی واپس جانا چاہتا ہے۔ میرا تو کہنا ہے کہ دنیا میں کہیں جنت نہیں ہے۔ کچھ چیزیں یہاں اچھی ہیں تو وہاں خراب، کچھ چیزیں یہاں خراب تو وہاں اچھی۔ اب اپنی اپنی پسند ہے جسے جو چاہے پسند کرلے۔ ہر جگہ طرز زندگی کی اپنی اپنی ڈیمانڈ ہے۔ ویسے اگر زندگی قناعت کے ساتھ گزاری جائے تو بہت سارے تردد سے بچا جاسکتا ہے۔ اپنے یہاں آرام زیادہ ہے سہولت کم۔ یہاں سکھ سہولت زیادہ ہے اطمینان کم مگر محنتی اور لگن والے ہر جگہ کامیاب رہتے ہیں۔

میں نے گذشتہ دس برسوں کے درمیان کناڈا اور امریکہ کا متعدد سفر کیا ہے اور نت نئے تجربے ہوئے ہیں، کئی خوبصورت مقامات بھی دیکھے ہیں۔ ان میں سے چند خاص کا تذکرہ دوسروں کے لیے بھی دلچسپ ہوسکتا ہے۔

نیاگرا فال:

دنیا کا مشہور ترین عجوبہ نیاگرا فال ٹورنٹو سے 80 کلومیٹر دوری پر امریکہ اور کناڈا کے بارڈر پر واقع ہے۔ دنیا کے بے شمار زائرین یہاں آتے ہیں۔ اس فال کے نزدیک کچھ دیر کھڑے ہوکر مشاہدہ کرنے سے ایسا لگتا ہے کہ پوری دنیا پانی میں سمٹ گئی ہو۔ اتنے بڑے پانی کے احاطے کا اتنی اونچائی اور روانی سے ہمہ وقت بہنا ایک انہونی بات لگتی ہے۔ اس فال کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے انتظامات بھی بہت بہتر ہیں۔ چند ڈالر کی فیس دے کر عارضی رین کورٹ پہن کر سرنگ کے ذریعے اسے بہت نزدیک تک جاکر دیکھا جاسکتا ہے۔ زیادہ شائقین کے لیے موٹر بوٹ کی بھی سہولت ہے۔ کچھ لوگ ہیلی کاپٹر کے ذریعے اس نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رات کے وقت تیز رنگ برنگی روشنی سے دور سے پانی کے بہاؤ پر فوکس دیا جاتا ہے جس سے فال کا حسن اور بھی دوبالا ہوجاتا ہے۔ کرسمس کے درمیان پورے نیاگرا قصبے کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے اور سبھی عمارتوں اور درخت پر مختلف رنگ کے قمقمیں ایک دلکش نظارا پیش کرتے ہیں۔ نیاگرا فال دنیا کا بے مثال ہنی مون (Honeymoon) شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہوٹل بھی ہیں جہاں سیاح ٹھہر سکتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے چینی رسٹورنٹ کا گرم سوپ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ گو نیاگرا فال کا بڑا حصہ کناڈا کی طرف ہے، امریکی حصے کی فال دیکھنے والوں کی بھی اچھی خاصی تعداد رہتی ہے۔ اس فال کی اونچائی تقریباً 150 فٹ ہے۔ اتنی مقدار میں سدابہار پانی انٹاریو لیک سے آتا ہے اور دوسری طرف ایک بڑی دریائی شکل میں نکل جاتا ہے۔ قدرت کا شاہکار نیاگرا فال یقیناً دنیا کا ایک بڑا عجوبہ ہے اور اس کا مشاہدہ زندگی کا ایک یادگار تجربہ۔

ٹورنٹو کے اطراف میں اور بھی کئی قابل دید جگہیں ہیں۔ یہاں کا Zoo ایک بہت بڑے خطے میں پھیلا ہوا ہے اور دنیا بھر سے طرح طرح کے جانور لاکر رکھے گئے ہیں۔ افریقی ہاتھی، زیبرا، ژیراف وغیرہ قابل دید ہیں۔ اسی طرح چمپینزی بھی اپنی حرکتوں سے زائرین کو لبھاتا ہے۔ پولر بھالو یخ بستہ پانی میں بخوبی تیرتا رہتا ہے۔ جگوار میں نے پہلی بار اسی ''زو'' میں دیکھا۔ اتنے مختلف قسم کے جانوروں کو یہاں رکھنے کے لیے خاص انتظامات کرنے ہوتے ہیں کیونکہ اکثر جانور گرم ملکوں سے لائے گئے ہیں اور یہاں کی سردی اور برفانی موسم سے ان کی حفاظت ضروری ہے۔ Zoo کے اندر صفائی کا بھی بہت بہتر انتظام ہے اور عام طور پر سبھی جانور صحت مند نظر آتے ہیں۔ مگر آزادی سے محرومی کا احساس تو انھیں ہوتا ہی ہوگا۔ شاید اسی لیے اسلامی نقطۂ نظر سے جانوروں کو قید و بند نہیں رکھنا چاہیے۔

ٹورنٹو میں ایک بہت بڑا رائل آنٹاریو میوزیم (Royal Ontario Museum) بھی ہے جو بہت معلوماتی ہے۔ یہاں سب سے بڑا ڈائنوسارس کا نمائشی ڈھانچہ بھی رکھا ہوا ہے جس نے مشہور فلم جوراسک پارک میں کام کیا تھا۔ اسی میوزیم کے ایک حصے میں سنٹر آف بائیوڈاورسیٹی اور کنزرویشن (Center of Biodiersity & Conservation) کا دفتر ہے جہاں میں نے 1997 میں کچھ دنوں والینٹیئر کے طور پر کام کیا تھا۔ میرے سپروائزر پروفیسر جے سی بارلو تھے جو اب ریٹائر ہوگئے ہیں۔ انھی دنوں ایک مشہور مورخ نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا عنوان تھا End of Science۔ کتاب کے اجرا کے سلسلے میں میوزیم میں ایک اجتماع ہوا جس میں شامل ہونے کے لیے 18 ڈالر فیس تھی۔ میرے لیے یہ رقم بہت زیادہ تھی مگر میٹنگ میں جانے کی خواہش شدید تھی۔ میں

نے پروفیسر بارلو سے اپنی الجھن ظاہر کی تو انھوں نے ایک پاس عنایت کردیا جو میوزیم کے Staff کے لیے فری تھا۔ جلسہ میں کتاب کے مصنف نے بہت پرزور لفظوں میں سائنس کی مخالفت کی اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ مستقبل میں سائنس پر بے حساب ڈالر خرچ کرنا فضول ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کئی ایک مثالیں بھی دیں۔ تقریر کے اختتام پر سوال و جواب ہوا۔ میں نے ایک سوال کیا کہ ''سائنس بذات خود کوئی چیز نہیں بلکہ علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور چونکہ رہتی دنیا تک علم کا حصول رہے گا تو آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ End of Science? ۔سوال وضاحت طلب تھا اور برجستہ بھی اور باوجود یہ کہ اس نے ادھر ادھر سے وضاحت کرنی چاہی، میرا سوال اتنا چبھتا ہوا اور واضح تھا کہ اس کی تقریباً ایک گھنٹہ کی تقریر پر بھاری پڑ گیا۔ بعد میں چائے کے درمیان کئی لوگ میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ میں کس ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔ ٹورنٹو کا Ontario Science Centre بھی بہت معلوماتی ہے اور اس کے تفصیلی مشاہدے کے لیے تو کئی دن درکار ہیں۔ سائنسی ایجادات و اصول کو نہایت واضح انداز میں سجایا گیا ہے اور موقع ہو تو ضرور دیکھنا چاہیے۔

ٹورنٹو سے کچھ دوری پر نیاگرا کی طرف انگور کی کاشت کی جاتی ہے اور اس کی شراب بھی بنائی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کی شراب انگور کو قدرتی برف میں تخ (Freez) کرکے بنائی جاتی ہے اور جس کے لیے سرد ترین موسم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ انگور کے خوشوں کو برف سے تخ بستہ ہونے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے، علی الصباح اسے جمع کر کشید گر مشینوں میں ڈال کر شراب نکالی جاتی ہے جو کافی مہنگی اور لذیذ ہوتی ہے اور دور دراز تک سپلائی کی جاتی ہے۔ اسے Ice Wine کہتے ہیں۔ دنیا میں شاید اور کہیں اس طرز کی شراب نہیں بنتی ہے۔ ٹورنٹو میں Skydome اور CN ٹاور بھی زائرین کے لیے خاص جگہیں ہیں گو کہ اس کی سیر مہنگی ہے۔ مگر اتنا اونچا اور گھومتا ہوا ریسٹورنٹ دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ اسی طرح اسکائی ڈوم بھی اپنی مثال آپ ہے جہاں باہر موسم جیسا بھی ہو اس کے اندر مناسب درجۂ حرارت رکھا جاسکتا ہے اور اس کے اندر میدان کو بارش اور برفانی موسم میں بھی خشک رکھا جاسکتا ہے تا کہ اندر جو پروگرام منعقد کیے جائیں بلاخطر چلتے رہیں۔ کھلے موسم میں اس کی کھسکنے والی چھت ایک طرف کو ہوجاتی ہے۔ تقریباً ایسا ہی نظام مدینہ منورہ کی مسجد نبوی کی چھت پر بھی ہے۔ ٹورنٹو کے اطراف اونٹاریو لیک کی وجہ سے قدرتی خوبصورت نظاروں سے مزین ہیں۔ ان جھیلوں میں پانی کی گہرائی اتنی ہے کہ بڑے بڑے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔ چونکہ اونچی نیچی سطح والی جھیلوں کے پانی کی گہرائی مختلف ہوتی ہے۔ Wayland میں نہایت ہی دلچسپ طریقے سے جہاز کو ایک جھیل سے دوسری جھیل میں اتارتے ہیں۔ جہاز کو بڑی مہارت سے ایک بڑے حوض کے اندر لاکر اونچی سطح سے نیچے لاتا ہے تو ٹینک کے پانی کو پمپ آؤٹ کرکے اس کی سطح کم کرلی جاتی ہے۔ جب اسے نچلی سطح سے اوپر والی سطح پر لے جانا ہوتا ہے تو ٹینک کے اندر پانی ڈال کر اس کی سطح اونچی کردی جاتی ہے اور جہاز آسانی سے اپنی منزل پر رواں دواں ہوجاتا ہے۔ مشینی دور اور انسانی ذہن کا یہ ایک دلچسپ کارنامہ ہے۔ ویسے انسان نے چاند پر قدم رکھ کر اور مریخ کی طرف قدم بڑھا کر تو یہ ثابت کردیا ہے کہ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یونیورسٹی آف ٹورنٹو:

ویسے تو کناڈا میں بلکہ خود ٹورنٹو میں کئی ایک یونیورسٹی ہے، مگر یونیورسٹی آف ٹورنٹو ایک بہت مشہور 175 سال پرانی اور بڑی یونیورسٹی ہے جس کے بہت سارے شعبہ جات تین الگ الگ کیمپس پر محیط ہیں۔ یہاں کے طالب علموں میں چینیوں کی ایک بڑی تعداد ہے اور اندازاً 20 فیصد لڑکے اور لڑکیاں چینی نظر آتے ہیں۔ اساتذہ میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ دنیا کے تجارتی امور پر سبقت کے ساتھ ساتھ چینی تعلیمی میدان میں بھی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ سب ان کی بے پناہ محنت کا نتیجہ ہے۔ گو کہ طالب علموں میں ہندوستان، پاکستان بنگلا دیش، عرب وغیرہ کے مسلمان طالب علم بھی ہیں مگر مسلم استاد کے نام بہت تلاش کرنے پر بھی شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آئندہ حالات کچھ بدلیں۔

باٹا میوزیم:

شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دنیا کی مشہور جوتے کی باٹا کمپنی کا مرکزی دفتر کناڈا کے ٹورنٹو شہر میں ہے۔ یونیورسٹی آف ٹورنٹو کے نزدیک ہی ان کا ایک کافی بڑا میوزیم بھی ہے۔ جس میں طرح طرح کے جوتوں کی نمائش نہایت دلچسپ انداز میں کی گئی ہے۔ پانچ ڈالر داخلہ فیس ہے اگر کسی کے پاس وقت ہو تو اس کی سیر سے محظوظ ہونا چاہیے۔

دوسرے جدید شہروں کی طرح ٹورنٹو میں بڑے بڑے مال یعنی بند بازار بھی ہیں جن میں کئی منزلیں اور سیکڑوں دکانیں ہوتی ہیں۔ یہ مال نہایت خوبصورت ہوتے ہیں اور ان میں اچھی خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ ایرکنڈیشن ہونے کی وجہ سے یہاں خرید فروخت بہت سہولت سے ہوتی ہے مگر دوسرے بازاروں کی بہ نسبت اکثر سامان یہاں مہنگے بکتے ہیں۔ اب تو ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی ایسے بازاروں کا چلن عام ہورہا ہے۔

اگرچہ کناڈا کا دارالسلطنت اوٹاوا ہے مگر تجارتی و دیگر امور میں ٹورنٹو ہی

یہاں کا سب سے بڑا مرکز ہے اور یہاں کی آبادی بھی سب سے زیادہ ہے لہٰذا اسی لحاظ سے یہاں کے مسائل بھی ہیں۔ شہر کے اندر سب سے بڑا مسئلہ کار کی پارکنگ کا رہتا ہے۔ اور اگر ذرا بھی غلطی ہوجاتی ہے تو کافی جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ سائنسنس کے پوائنٹس بھی کٹتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر اکثر لوگ شہر کے اندر سفر کے لیے زمین دوز ٹرین، ٹرام یا بس کی سواری کو ترجیح دیتے ہیں۔ چونکہ یہاں کے فٹ پاتھ بہت صاف ستھرے اور کشادہ ہوتے ہیں اس لیے اچھے موسم میں پیدل چلنے کا مزہ اور ہی ہے۔ اس شہر میں لگاتار نئی عمارتیں بنتی رہتی ہیں مگر بے گھر بار (Homeless) بھی بہت سارے نظر آتے ہیں۔ گو کہ حکومتی و غیر حکومتی ادارے ان کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں مگر شدید سردی کے زمانے میں اکثر منفی 40oc میں ان لوگوں کا متواتر راتیں سڑک پر گزارنا ایک افسوسناک سانحہ ہے۔

کناڈا کی امیگریشن پالیسی بہت لچکدار ہے لہٰذا ٹورنٹو میں برصغیر اور دیگر ملکوں سے اچھے خاصے مسلمان آکر بس گئے ہیں۔ بڑی تعداد خاص کر ان لوگوں کی ہے جو عرب میں کام کرتے تھے اور صاحب حیثیت تھے۔ کئی بڑی مساجد بن گئی ہیں اور آباد رہتی ہیں۔ اپنے حالیہ سفر (فروری 2004) کے درمیان تھکٹ مسجد میں قائم ایک اسکول کی توسیع کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے والی عشائیہ میں شرکت کا موقع ملا اور یہاں کے مسلمانوں کی فراخدلی کا اندازہ ہوا۔ صرف ایک گھنٹہ کے اندر ایک لاکھ پانچ ہزار ڈالر کا چندہ ہوگیا۔ رقم فراہم کرنے کا طریقہ بھی بے حد دلچسپ تھا۔ تقریب کئی لوگوں کی مؤثر تقریروں پر مبنی تھی۔ اخیر میں ایک عرب ڈاکٹر صاحب نے پرجوش تقریر انگریزی میں کی اور کہا کہ ایک لاکھ ڈالر جمع کرنے کا ٹارگیٹ ہے۔ انھوں نے شروع میں کہا کہ مجھے زیادہ لوگوں کو چندہ کی زحمت ابھی نہیں دینی ہے صرف دس افراد ایسے آگے آئیں جنھیں دس دس ہزار ڈالر عطیہ کرنا ہے۔ پانچ افراد نے نام لکھا دیے۔ پھر انھوں نے کہا کہ مجھے 120 افراد ایسے چاہئیں جو 3 ہزار چندہ دے سکتے ہیں۔ 6 افراد نے نام لکھا دیے۔ اس طرح 68 ہزار ہوگئے۔ اب انھوں نے کہا کہ 16 افراد ایسے سامنے آئیں جو 2 ہزار دے سکتے ہوں، پانچ صاحبان نے پھر اپنا نام لکھا دیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ 25 افراد ہزار ہزار کا چندہ دیں، 20 نے ہزار کے لیے اور دس افراد نے 500 کی رقم کے لیے نام لکھا دیا۔ اس طرح ایک لاکھ سے زیادہ ڈالر جمع ہوگئے۔

ہم دیکھتے رہے اور داد تحسین دیتے رہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ دوسرے لوگ مایوس نہ ہوں اور جنھیں جو بھی دینا ہے دیں۔ اس طرح پانچ ہزار کی مزید رقم جمع ہوگئی۔ اس مسجد کے نزدیک اسلامک سنٹر آف نارتھ امریکہ کا ایک بک شاپ ہے جہاں اسلامی کتابوں کا بہترین ذخیرہ ہے۔ امید افزا بات یہ ہے کہ ڈھیر سے ڈھیر سے کافی مدرسے اور اسلامی طرز کے اسکول کھلتے جا رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ نئی نسل بے راہ روی سے بہت حد تک بچی رہے گی مگر یہاں کی عام روش اور نوجوان نسل کو ہر طرح کی آزادی ایسی خطرناک چیز ہے کہ پتہ نہیں کچی کونپلیں کب جھلس جائیں۔ ٹورنٹو میں سکھوں کے کئی ایک گرودوارے اور ہندوؤں کے مندر بھی ہیں۔ سہولتیں ہیں اور آرام ہے مگر تقریباً سبھی لوگ اپنے اپنے وطن کو بے حد یاد کرتے ہیں۔ ہندوستان نے دہرے شہریت (Double Citizenship) کا سسٹم پاس کرکے یہاں کے ہندوستانی لوگوں میں خوشی کی ایک نئی لہر پیدا کردی ہے۔ ہوسکتا ہے اس طرح لوگ امریکہ، کناڈا وغیرہ کو بھی ممبئی، دلی اور کولکاتا کی طرح ذریعۂ معاش حاصل کرنے کی جگہیں سمجھیں گے اور اصل وطن ہندوستان کو بنائے رکھیں گے۔ واللہ عالم۔

مونٹریال:

فرانسیسی آبادی کی کثرت والا یہ شہر کناڈا کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ کئی سالوں سے اسے کناڈا سے بالکل الگ کردینے اور کیوبک صوبہ کو ایک نئے ملک بنانے کی ناکام کوشش جاری ہے۔ یہاں کی عام زبان فرانسیسی ہے مگر انگریزی سے بھی کام چل جاتا ہے۔ یہاں کئی یونیورسٹیاں ہیں مگر سب سے بڑی اور مشہور میکگل (MacGili) یونیورسٹی ہے جہاں کے Avian Science Center میں میں نے مارچ 2000 میں لکچر دیا تھا۔ اس سنٹر میں پروفیسر برڈمین کی قیادت میں کئی عنقا (Endangered) پرندوں پر ریسرچ ہورہی ہے۔ مونٹریال کی ایک دلچسپ عمارت وہ چرچ بھی ہے جسے اپنی جگہ سے تقریباً سو میٹر بعین ہی ہٹاکر دوسری جگہ نصب کردیا گیا ہے۔ دیگر عمارتیں، سڑک، ٹریفک وغیرہ کسی ترقی یافتہ یورپی ملک کی طرح ہے مگر فرانسیسی نژاد کی کثیر آبادی کی وجہ سے خواتین زیادہ فیشن زدہ نظر آتی ہیں۔ بس اور زمین دوز ٹرینوں کی سروس بہت اچھی ہے۔ ٹھنڈک کافی پڑتی ہے بلکہ موسم سرما میں تو شہر کے ندی، نالے بھی برف کی تہہ دار چٹان بن جاتے ہیں۔ ایسے دریاؤں میں مچھلی کا شکار ایک دلچسپ طریقے سے ہوتا ہے۔ دریا کے وسط میں برف کو کھود کر بڑا سوراخ کردیتے ہیں جہاں مچھلیاں غذا و ہوا کے لالچ میں آجاتی ہیں اور پھر برچھی جیسے اوزار سے آسانی سے شکار ہوجاتی ہیں۔

مونٹریال میں مسلمانوں کی آبادی دوسرے امریکی شہر کے نسبتاً کم ہے مگر پھر بھی کئی مساجد اور مدارس ہیں۔ مسلم آبادی کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہاں ہر بچے کو اسکول میں فرانسیسی پڑھنا لازم ہے بلکہ مکمل تعلیم فرانسیسی میں دی جاتی ہے۔ یہاں کے کئی گرجا گھر مشہور سیاحی مرکز ہیں۔

اوٹووا(Ottawa):

کناڈا کا دارالسلطنت اوٹووا ایک چھوٹا شہر ہے۔ ٹورنٹو سے مونٹرائل جانے والی کئی بسیں اس شہر سے ہوکر گزرتی ہیں۔ دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے یہاں سرکاری اداروں اور سفارت خانوں کی بھرمار ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی کافی بڑی ہے اور طالب علم زیادہ تر رہائشی ہاسٹل میں ہی رہتے ہیں۔ یونیورسٹی جدید و قدیم عمارتوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کا بس ٹرمینل کافی مشغول رہتا ہے اور اس کی دیکھ بھال، صفائی وغیرہ بھی قابل تعریف ہے۔ بس اسٹینڈ ہائی وے کے بالکل متصل ہے اور دیگر شہروں کی طرح مشغول علاقوں میں نہیں جس کی وجہ سے سفر میں بے جا وقت برباد نہیں ہوتا۔ شمالی اور جنوبی دونوں ہی امریکہ میں بس کا سفر نہایت ہی کارآمد اور نسبتاً ارزاں ہوتا ہے۔ بسیں بھی جدید ایرکنڈیشن اور باتھ روم وغیرہ سے لیس رہتی ہیں اور زیادہ تر وقت کی پابند بھی۔ اوٹووا کی دوسری قابل دید جگہوں میں ریڈو کنال ہے۔ کناڈا کا تیسرا بڑا مگر خوبصورت ترین خطہ برٹش کولمبیا ہے جس کا دارالسلطنت وکٹوریا ہے۔ اسے وین کوور بھی کہتے ہیں۔ ٹورنٹو سے اس کی دوری اور خرچیلے سفر کی وجہ سے میرا اب تک وہاں کا سفر نہیں ہوسکا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ:

گذشتہ چند دہائیوں سے امریکہ سوپر پاور بنا ہوا ہے ورنہ 1972 تک یہاں آنے والے ہندوستانیوں کو گرین کارڈ ایرپورٹ پر ہی دے دیا جاتا تھا۔ اب تو حالات بہت بدل گئے ہیں بلکہ 11 ستمبر 20001 کے سانحہ کے بعد تو امریکہ تقریباً ایک بند ملک ہوگیا ہے اور وہاں جانے والوں کو طرح طرح کی پابندیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ میں کناڈا کا Landed Immigrant ہوں، مارچ 2003 تک مجھے امریکہ جانے کے لیے کوئی ویزا کی ضرورت نہ تھی لہٰذا جون 1997 اور جولائی 2003 کے درمیان میں نے وہاں کا متعدد سفر کیا۔ اپریل 2004 سے دس سال کا متعدد دخول کا ویزا میں نے لے رکھا ہے۔ کبھی ہفتہ کبھی مہینہ اور کبھی اس سے بھی لمبی مدت گزاری۔ وہاں کی کئی یونیورسٹی اور اداروں میں لکچر دیے اور کئی نیشنل پارکس بھی گھومنے کا موقع ملا۔

نیویارک سٹی:

نیویارک امریکہ کی ایک بڑی ریاست ہے جس کا سب سے بڑا شہر نیویارک سٹی ہے۔ یہ شہر تقریباً 4 حصوں میں بٹا ہوا ہے اور یہاں کی آبادی کثیر اور گنجان ہے۔ اونچی اونچی عمارتوں، باغات، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں کی بھرمار ہے۔ دنیا بھر کے سیاحوں کا محبوب ترین شہر ہونے کے ساتھ یہاں جرائم بھی کثرت سے ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے نیویارک امریکہ کا دل ہے اور اس کی دھڑکن سے پورے ملک کی بقا اور سالمیت وابستہ ہے جس کا بار بار اظہار نیون ٹاور کے سانحہ کے درمیان کیا گیا۔

اس شہر کا جائے وقوع بھی بہت دلچسپ ہے۔ یہاں کے راستے سمندری پانی کے اندر سرنگ بنا کر یا بڑے پل سے گزرتے ہیں۔ امپائر اسٹیٹ بلڈنگ دنیا کی خوبصورت اور بلند ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ جب کہ Twin Towers جنھیں 2001 میں ہوائی جہاز ٹکرا کر تباہ کردیا گیا دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ اس حادثہ میں تقریباً 4 ہزار لوگ جاں بحق ہوئے تھے۔ ان دنوں میں نیویارک سے متصل نیوارک میں مقیم تھا۔ اسی جگہ پھر سے ایسا ہی ٹاور بنانے کا منصوبہ بنالیا گیا ہے جس میں دس سال اور تقریباً 2 سو بلین ڈالر صرف ہوں گے۔ نیویارک میں یوں تو بہت سے دلچسپ ادارے ہیں مگر یہاں کا میوزیم بہت بڑا اور معلوماتی مرکز ہے جہاں مجھے لکچر دینے اور Stuff-bird کے مشاہدہ کا بھی موقع ملا۔ اگر مکمل طور پر اس میوزیم کو دیکھا جائے تو ایک ہفتہ بھی ناکافی ہے۔ ہر سیکشن معلومات کا خزانہ ہے۔ مجھے اس میوزیم میں رکھے ہوئے پرندوں کے مشاہدے کی صلاح میرے استاد مرحوم ڈاکٹر سالم علی صاحب نے دی تھی جنھوں نے بجا طور پر کہا تھا کہ اس میوزیم کے پرندوں کے مشاہدے کے بغیر دنیا کے پرندوں سے متعلق واقفیت کی سیری حاصل نہیں ہوسکتی۔ مجھے یہاں ایک باربٹ (Barbet) 1931 میں پروفیسر اسٹریسی مین کی پکڑی اور Stuff کی ہوئی ملی۔ پروفیسر اسٹریسی مین برلن یونیورسٹی اور برلن میوزیم میں ماہر طیور تھے اور ڈاکٹر سالم علی کے استاد بھی تھے۔ گویا کہ میں اس سلسلے کی تیسری نسل کا طالب علم اپنے گروپ کے ایک پرندے کا مشاہدہ کررہا تھا۔

نیویارک کا جے اف کینڈی ایرپورٹ بہت بڑا اور نہایت مصروف ہوائی اڈہ ہے۔ یہاں کی دیگر قابل دید جگہوں میں آزادی کا مجسمہ (Status of Liberty) بھی سیاحوں کا مرکز ہے۔ 4 جولائی امریکہ کا یوم آزادی ہوتا ہے۔ اور اس دن نیویارک سے متصل ہڈسن دریا میں امریکی بیڑے اور معرکہ خیز ہوائی جہازوں کی بھرپور نمائش ہوتی ہے جسے دیکھنے والوں کا بڑا میلہ لگتا ہے۔ تمام ملک میں رات میں جگہ جگہ بڑے پیمانے پر آتش بازی ہوتی ہے۔ جولائی 2004 میں دربھنگہ میڈیکل کالج کے Alumni کے ایک سہ روزہ میٹنگ میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ اس موقع پر کناڈا، برطانیہ اور امریکہ میں بسنے والے دربھنگہ میڈیکل کالج سے پاس ڈاکٹر صاحبان خوش گوار ماحول میں مادر درسگاہ کو خراج تحسین پیش کررہے تھے۔ مشاعرہ، کوی سمیلن اور کئی رنگارنگ پروگرام پر مشتمل یہ میٹنگ نہایت دلچسپ تھی۔ چونکہ میرا تعلق بھی دربھنگہ سے ہے اس

لیے میں اور بھی محظوظ ہو رہا تھا۔ ہر پروگرام کے اختتام کے بعد طعام اور مشروب کا عمدہ انتظام تھا۔

نووارک (Newark):

نیویارک سٹی سے صرف 30 کلومیٹر کی دوری پر نووارک سٹی ہے جو کہ گارڈن صوبہ نیوجرسی کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے مگر یہاں سیاہ فام کی کثرت ہے جس کی وجہ سے ایک افریقی حصہ لگتا ہے۔ امریکہ میں رہنے والے افریقی نژاد کالے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ان کے عادات و اطوار، زبان، کلچر سبھی الگ ہیں۔ چونکہ انھیں امریکہ میں بہت دنوں تک غلامی کی زندگی گزارنی پڑی ہے، عام طور پر یہ لوگ بڑے ہی تنگ مزاج اور جھگڑالو ہوتے ہیں اور جرائم وغیرہ میں بھی ملوث۔ ذرا سی بات پر مارنا، مرجانا عام بات ہے۔ صبر وضبط کا مادہ تو شاید انھیں چھوکر چلا گیا ہے۔ عورتیں بھی بہت تنگ مزاج اور Aggresive ہوتی ہیں۔ ان میں جنسی بے راہ روی بھی بہت زیادہ ہے۔ مگر دوسری طرف یہی لوگ امریکہ و کناڈا میں زیادہ مسلمان ہورہے ہیں۔ اللہ کرے اس مذہب کے ذریعہ ان کی اصلاح ہوجائے۔ نووارک کے کالوں کی ایک مسجد میں میں نے مہینوں جمعہ کی نماز ادا کی اور تقریباً ہر جمعہ میں ایک یا دو لوگوں کو مشرف بہ اسلام ہوتے دیکھا۔ ان کے جمعہ کے خطبے مجھے بہت دلچسپ لگے کیونکہ امام ان خطبوں میں حالات حاضرہ پر بھرپور بیان کافی مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی مساجد میں اکثر مدرسے اور اسکول بھی چلتے ہیں اور دیگر تقریب بھی ہوتی ہے۔ گوکہ نئی مساجد بھی بن رہی ہیں مگر کئی ایک پرانے چرچ خرید کر مسجد میں تبدیل کر لیے گئے ہیں۔ ایک بار یہاں سے تقریباً دو سو میل دور ایک جگہ پر تبلیغی جماعت کے ایک بہت بڑے اجتماع میں شرکت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

نووارک اور اس کے نواح میں کئی ایک میوزیم اور دیگر قابل دید مقامات ہیں مگر تھامس الوا اڈیسن کے نام کا ایک بہت دلچسپ میوزیم ہے۔ خدا نے اس انسان میں بے پناہ صلاحیتیں دی تھیں اور اسے موجودہ دنیا کی ہزاروں کارآمد چیزوں کا موجد بنایا۔ ویسے قدرتی صلاحیت اکثر انسانوں میں ہوتی ہے۔ مگر ان کا اجاگر کرنا اور بروئے کار لانا اپنے آپ پر منحصر ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اور کائنات کی تسخیر اس کی مرہون منت ہے۔ تبھی آج انسان چاند اور مریخ پر بسنے کے لیے پرتول رہا ہے۔ نووارک سے 2 گھنٹے کی مسافت پر اٹلانٹک سٹی ہے یہاں ہوٹلوں اور کسینوں کی بھرمار ہے اور خوب گہما گہمی رہتی ہے۔ جوئے خانے اور شراب خانے رات بھر کھلے رہتے ہیں۔

متحدہ ہائے امریکہ چھوٹے بڑے پچاس صوبوں پر مشتمل ایک بہت بڑا ملک ہے۔ مالی حالت اچھی ہونے کی وجہ سے دنیا کے ہر علاقے کے لوگ یہاں جوق در جوق چلے آرہے ہیں۔ یہاں کے سبھی شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی یہاں بلائیں۔ لہٰذا امیگریشن کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ثقافتی اور لسانی تنوع بہت ہے بلکہ حیاتیاتی تنوع میں بھی امریکہ مالا مال ہے۔ اتنے بڑے ملک میں آمد و رفت کے وسائل بے مثال اور بے حد منظم ہیں۔ شمال کے علاقے ٹھنڈے تو جنوب و مغرب کے علاقے زیادہ تر گرم ہیں۔ باوجود وقت اور وسائل کی کمی کے میں نے کئی اہم علاقوں کا سفر کیا۔ فلوریڈا، کلوراڈو، اٹلانٹا، لاس ویگاس، ڈلاس، شمال و جنوب کیرولائنا، واشنگٹن وغیرہ کا چکر لگایا۔ جون 2004 میں اسٹیٹ یونیورسٹی آف سن فرانسسکو کی دعوت پر Sound Recording کی ایک ورک شاپ میں شرکت کی جس کے کامیاب اختتام پر دنیا بھر میں مشہور کارنل یونیورسٹی سے ڈپلومہ بھی ملا۔ کیلی فورنیا کے سیارا ناہو جنگل کے اطراف میں گزارے یہ دس دن اور وہاں کے پرندوں کا مشاہدہ، ان کی آواز ٹیپ کرنا ایک ناقابل فراموش تجربہ رہا۔ اس دس روزہ ورک شاپ کی فیس تقریباً ایک ہزار ڈالر تھی مگر میری شمولیت فری کردی گئی تھی۔ ہاں نووارک سے رینو (Reno) تک کے ہوائی سفر کا خرچ مجھے دینا پڑا تھا جو تقریباً تین سو ڈالر تھا۔ میں نئی ورکشاپ Biology of Indian Barbets Importance of wildlife conservation from Islamic Perspective کی چند جلدیں ساتھ لے آیا تھا جو مندوبین نے خرید لیں اور اس طرح ہوائی ٹکٹ بھی تقریباً فری ہوگیا۔ 5 ہزار فٹ کی بلندی پر تھا اور طرح طرح کے پرندوں کا مشاہدہ ہمارے لیے بہترین تحفہ تھا۔ ڈسپلن اور اوقات کی پابندی ہمارے کیمپ کی خاصیت تھی۔ شدید سردی کے باوجود ہم 4 بجے صبح میں تیار ہوجاتے۔ ہلکا ناشتہ اور چائے کے بعد ہم لوگ پرندوں کی آواز ریکارڈ کرنے کے اوزار سے لیس ہوکر جیپ میں سوار ہوکر روزانہ 30-40 میل دوری کی مسافت پر مختلف علاقوں میں جاکر گیارہ بجے دن تک ان کی آواز ریکارڈ کرتے۔ پھر وہیں بڑا ناشتہ ملتا اور 2 گھنٹے مزید ریکارڈنگ اور مشاہدے کے بعد ہم لوگ ڈیڑھ دو بجے کیمپ واپس آتے۔ لنچ کے فوراً بعد لیکچر کا سلسلہ شروع ہوجاتا جو 7 بجے شام تک چلتا۔ پھر صبح کی ریکارڈ کی گئی آوازوں کو کمپیوٹر پر ریکارڈ کرنا ہوتا، پھر ان کا تجزیہ (Analysis) کرکے دن کی ڈائری پوری کی جاتی۔ 9 بجے شام میں ڈنر کے بعد مشروب کا دور ہوتا اور تقریباً دس بجے مجلس برخاست ہوتی۔ کل تقریباً 22 ڈیلیگیٹس تھے جن میں میں اکیلا ہندوستانی، ایک چینی لڑکی، دو نیوزی لینڈ کے مندوبین، 4 کناڈا کے اور باقی سب امریکی تھے۔ سبھی لوگ بہت مہذب، بااخلاق اور امداد باہمی کے پیکر تھے۔ مرد اور عورتوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ قیام ٹینٹ میں تھا اور کھانے اور

کلاس کا نظم ایک بڑے ہال نما کمرے میں رہتا۔ مجموعی طور پر یہ علاقہ نہایت خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ باوجود اس کے کہ کوئی گندگی نہیں پھیلاتا سڑک پر جگہ جگہ یہ تختی آویزاں تھی کہ گندگی پھیلانے والے کو پکڑے جانے پر 2 ہزار ڈالر جرمانہ کیا جائے گا۔ ان علاقوں میں جگہ جگہ پر مقامی لوگوں کی آبادی بھی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کسان اور Cowboys طرز کے لوگ تھے۔

رینو کا ہوائی اڈا بھی نہایت خوبصورت ہے۔ چونکہ ان علاقوں میں موسم سرما میں سیاحوں کی بھرمار رہتی ہے، بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ہوائی اڈا پر وقت گزارنے کے لیے کسینوں کی کثیر تعداد ہے جہاں اکثر مسافر مشین پر جوا کھیلتے نظر آتے ہیں۔ واپسی میں میرا قیام رینو یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں تھا اور اس طرح میں نے اس چھوٹی مگر خوبصورت یونیورسٹی کی ایک جھلک بھی دیکھی۔

فلوریڈا کا دارالسلطنت تالا ھاسی ہے۔ بہت ہی پرفضا مقام ہے اور اس کے اطراف میں گھنے جنگل اور نشیبی علاقے ہیں جہاں چرند و پرند کی بہتات ہے۔ تالاھاسی سے 80 میل کی دوری پر ایک زمین دوز میوزیم ہے جو جنگل کے اندر Caves (غاروں) کی شکل میں ایک دلچسپ مقام ہے۔ کافی سیاح یہاں آتے ہیں اور پانی کے قطروں کی جماوٹ سے بنے دلچسپ شکلوں اور مجسموں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ قدرت نے انسانوں کو کیسے کیسے نادر تحفے اور عجائبات سے نوازا ہے اس کا اندازہ ان جگہوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ میں نے تالا ہاسی کے دو یونیورسٹی میں Lecture دیے اور ایک ہفتہ قیام کے درمیان خوب Birdwatching کی۔ مجھے ہمنگ برڈ دیکھنے کی بہت تمنا تھی جو یہاں پوری ہوئی۔ یہاں کی ایک تکنیکی اور زرعی Florida Mechanical & Agriculture یونیورسٹی زیادہ تر کالے فلمی ستاروں کے مالی تعاون پر چلتی ہے۔ یہاں سے 2 گھنٹے کی مسافت پر گینز ویل میں یونیورسٹی آف فلوریڈا ہے جہاں مجھے اکتوبر 2003 میں لکچر دینے کا موقع ملا۔ یہ ایک بہت قدیم اور بڑی یونیورسٹی ہے جہاں تقریباً 51 ہزار طالب علم پڑھتے اور قیام کرتے ہیں۔ بے حد خوبصورت کیمپس ہے اور باغ اور پیڑوں کی کثرت ہے۔ یہاں پروفیسر رچارڈ فولز کے زیر قیادت مذہب اور ماحولیات پر بھی بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔ میری حالیہ چھپی کتاب Perspective Importance of Wildlife Conservation from Islamic کو بے حد سراہا گیا۔ اس یونیورسٹی میں کئی نوبل انعام یافتہ پروفیسر تعلیم دے رہے ہیں۔

نووارک فلوریڈا کا سفر میں نے تین بار بس سے کیا۔ حالانکہ بس کے سفر میں وقت بہت صرف ہوتا ہے مگر راستے میں کسی بھی ملک کے شہر، دیہات، جنگل، وادی، دریا اور دیگر نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے تو بس کا سفر سب سے اچھا اور سستا ہوتا ہے۔ یوں تو اپنی کار سے بھی لمبے سفر کا مزہ خوب ہے مگر بس میں انسان زیادہ پرسکون اور Carefree رہتا ہے۔ امریکہ و کناڈا میں Gray Hound کمپنی کی بسیں آرامدہ اور سستی ہوتی ہیں۔ نووارک سے تالا ہاسی تقریباً 13 سو کلومیٹر کا سفر بس سے 25 گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ ہر چار گھنٹے بعد بس آدھے گھنٹے کے لیے صاف ستھرے بس اسٹینڈ پر رکتی ہے جہاں کھانے پینے کی سہولت رہتی ہے۔ چونکہ بس میں Bushback سیٹ ہوتی ہے رات میں مسافر آرام سے سو سکتے ہیں۔ ضروری فراغت کے لیے Washroom بھی ہوتا ہے۔ میں پچھلے دس سالوں سے ایسی بس سے سفر کر رہا ہوں مگر ان کے رکھ رکھاؤ میں بتدریج گراوٹ آرہی ہے۔ جولائی 2005 میں تالاہاسی سے واپسی کے درمیان ایک دلچسپ مگر تکلیف دہ تجربہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ہماری واپسی 8 بجے شام کے بس سے تھی۔ بس اسٹینڈ پر ڈھائی گھنٹے انتظار کے بعد ہمیں سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا اور واپس منور خالو کے گھر چلے گئے جن کے بڑے لڑکے ڈاکٹر دانش کے ولیمہ میں ہم لوگ آئے ہوئے تھے۔ دس ڈالر فی کس زیادہ دے کر تیسرے دن کی سیٹ ریزرو کرائی۔ اس دن جب بس اسٹینڈ آئے تو پھر سے بس لیٹ تھی۔ معلوم ہوا کہ ڈرائیوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے مگر کوئی نہ کوئی انتظام ہوجائے گا۔ ہمیں اس دن واپس ہونا ضروری تھا اس لیے انتظار کرتے رہے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اعلان ہوا کہ فلاں بس جائے گی۔ گوکہ ہماری اگلی بس جکسن ویلس شہر سے 12 بجے رات کی تھی اور اس کا ملنا اب محال تھا، ہم لوگ اس امید پر بس میں سوار ہوگئے کہ کوئی دوسری بس مل جائے گی۔ ایک خاتون ڈرائیور نے بس کو بس اڈے سے جس انداز سے نکالا میں نے اپنی بیٹی تزئین فاطمہ سے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید وہ نوسکھ ڈرائیور ہے۔ ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد اس نے اعلان کیا کہ کیا مسافروں میں کوئی جکسن ویلز کا راستہ جانتا ہے۔ رات کے دو بجے، اندھیرے میں اور بارش کے درمیان اگر کوئی ڈرائیور ہی راستہ پوچھے تو آپ اپنی کھوئی قسمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایک مسافر نے ڈرائیور کو گائیڈ کیا اور دو گھنٹے بعد بس شہر میں پہنچی مگر چونکہ خاتون بس ڈرائیور واقعی نئی تھی اسے بس اڈا تلاش کرنے میں مزید ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اس طرح ہم لوگ 4 گھنٹے دیر سے جکسن ویلز پہنچے۔ بس اڈے پر مسافروں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ بہت سارے لوگوں کی بس چھوٹ گئی تھی اور ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ امریکہ میں مجھے پہلی بار ایسی صورت حال کا سامنا تھا اور صدر بش کی ناکارے پن کا ایک نمونہ دیکھنے کو ملا۔ بڑے انتظار اور تگ و دو کے بعد ایک بس وہاں ملی جو دن بھر کی مسافرت کے بعد رات کے بارہ بجے نوراک پہنچی۔ اس طرح یہ سفر ایک منفی انداز کا یادگار سفر بن گیا۔

کاوران غار کی سیر:

صوبہ فلوریڈا شمالی امریکہ کے لوگوں کے لیے تفریحی مقامات کا خزینہ ہے۔ کناڈا، میکسیکو اور دیگر شمالی امریکی ملکوں کے علاوہ دنیا بھر کے سیاح یہاں سمندری ساحل، سبزہ زاروں، جنگلات اور بازاروں کی سیر کے لیے جوق در جوق آتے ہیں۔ اور لانڈو میں ڈزنی ورلڈ تو شاید دنیا کا سب سے مشغول ترین تفریح گاہ ہے جہاں بچوں اور بڑوں کے لیے ہفتہ بھر کی بھرپور تفریح کا سامان مہیا کر دیا گیا ہے۔

فلوریڈا کے صوبائی مرکز تالاہاسی کے اردگرد بھی کئی مشہور تفریح گاہیں ہیں۔ کاوران کے غار یہاں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ایک دلچسپ جگہ ہے جہاں پارک مختلف النوع مضافات (Habitats) کئی جانوروں اور پرندوں کا خاص مسکن ہیں مگر سب سے تعجب خیز اور دیدنی چیز اس پارک کے تقریباً ایک مربع کیلومیٹر میں پھیلے زمین دوز غار ہیں۔ ان غاروں کے اندر کیلشیم سے بھرپور پانی کے قطروں کی جمادٹ سے طرح طرح کے جانوروں، درخت اور عمارت جیسی شکلیں بن گئی ہیں جو قدرت کا ایک عجیب کرشمہ نظر آتی ہیں۔ تنگ درزوں اور کہیں کہیں قدرے کشادہ کمروں پر مشتمل ان غاروں کی سیر تقریباً ایک گھنٹے میں مکمل ہوتی ہے جس کے درمیان ایک گائیڈ اس کی تاریخ اور جغرافیہ کا بیان نہایت پرلطف انداز میں دیتا رہتا ہے۔ اس غار کے اندر کا درجۂ حرارت مستقل 65 ڈگری فارن ہائیٹ (سینٹی گریڈ) رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اندر کافی ٹھنڈک رہتی ہے غار کے اندر جگہ جگہ بلب بھی لگا دیے گئے ہیں جس سے اندرونی سفر میں سہولت رہتی ہے۔ گائیڈ بھی ٹارچ کی روشنی میں خاص خاص چیزوں کی نشان دہی کرتا رہتا ہے۔ غار میں مستقل اندھیرے کی وجہ سے کئی اندھیرا پسند جانور (جیسے کہ چمگادڑ سلامنڈر (Salamandar) کی دو قسمیں، چوہے، ایک لوبسٹر کی خاص قسم) بھی بسیرا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی سانپ بھی نظر آ جاتا ہے مگر یہ بھی جانور بے ضرر ہیں۔ جدید زمانے میں ان غاروں کی کھوج سب سے پہلے اس آفیسر نے کی تھی جو ان علاقوں کی سروے کے لیے آیا تھا۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہ غار مقامی آدی باسیوں کے مسکن بھی رہ چکے ہیں مگر یہ باتیں تحقیق طلب ہیں۔

غار کی سیر کے لیے انتظامات بھی مناسب ہیں مگر ہمارے لیے داخلہ فیس قدرے مہنگی ہے۔ چار پانچ افراد پر مشتمل ہر کار کے داخلے کی فیس 4 ڈالر ہے جب کہ غار کے اندرونی سیر اور گائیڈ کی فیس فی فرد 6 ڈالر ہے۔ یوں تو غار سال بھر کھلا رہتا ہے مگر کبھی کبھی تیز بارش کے درمیان اس میں پانی بھی بھر جاتا ہے جس وجہ سے اس کی سیر عارضی طور پر بند کر دی جاتی ہے۔

سہولت کے لیے پارک کے وسط میں ایک اسٹور بھی کھلا ہوا ہے جس میں کھانے پینے کی اشیا اور کچھ تحفے تحائف کے سامان ملتے ہیں مگر ہر ٹورسٹ جگہ کی طرح یہاں بھی سامان مہنگے ہوتے ہیں۔

پارک کے مدخل کے دفتر میں کئی معلوماتی پوسٹر اور فریم لگے ہوئے ہیں جن سے اس علاقہ کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہے اور پندرہ منٹ کی ایک ڈوکومنٹری فلم بھی دکھائی جاتی ہے جو زائرین کی واقفیت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ غار کے علاوہ بھی اس پارک میں کئی چیزیں مشاہدے کے لائق ہیں۔ پرندوں اور تتلیوں کے مشاہدے کے لیے تو یہ ایک بہترین جگہ ہے۔ اس طرح گھنے درختوں اور Creepers پر مشتمل پارک قدرتی مناظر سے بھرپور ہے اور یہاں کی ایک دن کی سیر زندگی کا ایک یادگار تجربہ۔

میں جناب منور خالو کا بہت ممنون ہوں جن کی ایما پر مجھے اس خوبصورت اور معلوماتی جگہ کے مشاہدے کا موقع ملا۔ برادرم ڈاکٹر دانش کے ولیمہ کے سلسلے سے تالاہاسی کا حالیہ سفر کاوران پارک کی سیر سے مزید دلچسپ ہو گیا۔

جولائی 2002 میں میں نے کولیراڈو یونیورسٹی میں بھی ایک لکچر دیا تھا۔ یہ یونیورسٹی ڈنور شہر سے متصل ہے۔ ڈنور کا ہوائی اڈا نہایت منظم، بڑا اور خوبصورت ہے۔ نیویارک سے تقریباً 5 گھنٹے کی ہوائی مسافت ڈلاس ہوتے ہوئے ڈنور لاتی ہے۔ یہ بھی بہت بڑی یونیورسٹی ہے اور راکی ماؤنٹین نیشنل پارک (Mountain National Park Rocky) کے نزدیک ہونے کی وجہ سے جانوروں اور پرندوں پر یہاں کافی ریسرچ ہو رہا ہے۔ میں یہاں پروفیسر چارلس ساؤتھ وک کی دعوت پر آیا تھا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 1960 کی دہائیوں میں پڑھا چکے تھے اور ان اطراف کے بندروں پر وہ ہنوز ریسرچ کر رہے ہیں۔ وہ اور ان کی اہلیہ بہت ہی خلیق اور ملنسار ہیں۔ جب مجھے اپنے گھر پر دعوت کے لیے بلایا تو اپنے ایک مقامی ہندوستانی دوست اور ان کی اہلیہ کو بھی دعوت دی تاکہ میں زیادہ محظوظ ہو سکوں۔ کھانے کے ٹیبل پر کھانے کے اختتام پر اجتماعی دعا ہوئی جو بہت ہی روح افزا تھی۔ دوسری دلچسپ بات یہ دیکھی کہ جب تک ہم لوگ کھانے کے بعد چائے پیتے رہے پروفیسر ساؤتھ وک نے کھانے کے برتنوں کو بڑی خاموشی سے دھو بھی دیا۔ ایک چھوٹا سا واش بیسن ڈائننگ ٹیبل کے نیچے ایسا فٹ تھا کہ مشکل ہی سے دکھائی دیتا۔ ہمیں ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ امریکہ ہی میں واقع دنیا کے پہلے Yellow stone کی طرح Rocky Mountain ایک بہت بڑا نیشنل پارک ہے جہاں مناسب موسم میں سیاحوں کی بھرمار رہتی ہے۔ طرح طرح کے پرند، ہرن، یاک وغیرہ سر راہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس پارک کی اونچی پہاڑیوں سے جب برف پگھلتی ہے تو پانی دو حصوں میں بٹ کر مشرق میں بحر اوقیانوس اور مغرب میں بحر الکاہل میں چلا جاتا ہے۔

ڈزنی ورلڈ:

میں نے اپنے صاحب زادے محمد طلحہ شائق سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ قرآن شریف ختم کرلیں گے تو انھیں ان کی پسند کی کوئی جگہ گھمانے لے جاؤں گا۔ Incentive بچوں کے لیے بڑی ہمت افزا چیز ہوتی ہے۔ طلحہ میاں نے بڑے ہی انہماک سے جلدی جلدی تقریباً دس مہینے کے اندر قرآن شریف ختم کرلیا۔ حسب وعدہ میں انھیں ڈزنی ورلڈ لے کر گیا جو تالاہاسی سے تین چار گھنٹے کی بس کی مسافت پر ہے۔ یہاں دنیا بھر سے ہزاروں لوگ روزانہ آتے ہیں۔ اس تعجب خیز جگہ پر کئی ایک دیدنی عجائبات اور تفریح گاہ ہیں ہیں جو بچوں ہی کے نہیں بڑوں کی بھی عقل دنگ کر دیتے ہیں۔ طلحہ نے بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ یونیورسل اسٹوڈیو کی سیر کا فیصلہ کیا۔ یہ اسٹوڈیو بہت بڑے احاطے میں پھیلا ہوا ہے اور داخلہ فیس بھی کافی مہنگی ہے، فی کس ستر ڈالر۔ جس قدر بھیڑ وہاں تھی اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ روزانہ کی سیل لاکھوں ڈالر کی ہوتی ہوگی۔ اندر جاکر وہاں کے انتظامات اور نمائشوں کو دیکھ کر کوئی بھی حیرت زدہ ہوجائے گا۔ ہالی ووڈ میں بنی کئی مشہور مہارت انگیز فلموں کے شوٹنگ سٹ جوں کے توں عام پبلک کے مشاہدے کے لیے محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ اس طرح انسانی عقل کے بہترین تفریحی ایجادات میں Twister, The Bats, Jaws, Earth Quake وغیرہ حیرت کردینے والے ایکشن سے بھرپور ہیں۔ ایک شو میں انتہائی خطرناک Stunt دکھائے جارہے تھے تو دوسرے میں پرندوں کی مشاقی پر مبنی تعجب خیز کرتب دکھائے جارہے تھے۔ چونکہ اسٹوڈیو کی داخلہ فیس ایک ہی بار لی جاتی ہے لہٰذا زائرین اگر چاہے تو سلسلہ وار کئی ایک شو دیکھ سکتا ہے۔ ضروری یہ ہے کہ وقت کی پابندی کی جائے اور آرام یا کھانے میں کم سے کم وقت لگایا جائے بلکہ کچھ کھانے کا سامان ساتھ رکھ کر شو دیکھتا رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ حصوں کو دیکھ سکے۔ بھیڑ کے لحاظ سے سکورٹی وغیرہ کا انتظام بھی مناسب ہے۔ ایک پورے دن کی بھرپور اور یادگار سیر کے لیے یونیورسل اسٹوڈیو کا مشاہدہ ایک کارآمد تفریح ہے۔ قدرت انسانی ذہن سے کیا کیا کام لے سکتی ہے اس کا اندازہ یہاں آکر ہوتا ہے اور یہ نظارے مہم جو بچوں کے لیے حیرت واستعجاب کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہوسکتے ہیں۔

واشنگٹن (Washington DC):

امریکہ کا دارالسلطنت واشنگٹن شہر ہے۔ میں نے 1999 میں یہاں کا پہلا سفر کیا تھا، ویسے بس اسٹینڈ سے متعدد بار گزرا مگر تفصیلی سیر جولائی 2006 میں کی جبکہ میرے بڑے بھائی صاحب پروفیسر شاکر احمد یحییٰ، ان کی اہلیہ، بنی زیب اور میری فیملی بھی ہمراہ تھی۔ میرے بڑے نسبتی بھائی میاں یوسف بھی اپنی فیملی کے ساتھ تھے۔ لہٰذا اس سفر میں بہت تفریح رہی۔ یہاں کے پارلیمنٹ ہاؤس، وہائٹ ہاؤس، واشنگٹن میموریل ٹاور اور اسمتھ سونین میوزیم وغیرہ قابل دید مقامات ہیں۔ ہوائی جہازوں، راکٹوں اور میزائل وغیرہ کا ایک بڑا میوزیم ہوائی سفر کے ارتقا کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور نہایت ہی معلوماتی ہے۔ سیاحوں کے لیے سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں کی کسی بھی قابل دید جگہ کی کوئی داخلہ فیس نہیں ہے۔ لہٰذا مقامی و بیرونی سیاحوں کی یہاں بھرمار رہتی ہے۔ میں یہاں پہلی بار ڈاکٹر سالم علی کے دیرینہ دوست اور ہم مصنف ڈاکٹر اس ڈی ریپلی کی ایما پر آیا تھا۔ ان دونوں نے مل کر ہندو پاک کے پرندوں پر معرکہ آرا کتاب Handbook of the Birds of India & Pakistan تصنیف کی ہے جو 10 جلدوں پر مشتمل ہے اور پرندوں پر تحقیق کرنے والا کوئی بھی طالب علم بغیر اس کے مطالعے کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اب تو دونوں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ اسمتھ سونین میوزیم بہت ہی کشادہ اور معلوماتی خزانوں سے بھرپور ہے۔ یہاں کے نوادرات میں دنیا کا سب سے بڑا ہیرا بھی ہے جسے دیکھنے کا موقع ملا۔ ریپلی صاحب ان دنوں بہت علیل ہوگئے تھے لہٰذا ان کی سکریٹری پامیلا نے میزبانی کی اور میوزیم دکھایا۔ یہاں پرندوں پر بھی کافی ریسرچ ہو رہا ہے۔ ہمارے شعبہ وائلڈ لائف سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فارغ ایک طالبہ ڈاکٹر فرحا اشتیاق نے کافی دنوں تک اس ادارے میں پوسٹ ڈاکٹریٹ ریسرچ کیا ہے۔ اب وہ لندن میں ہیں۔

وہائٹ ہاؤس کے لان سے زمیندوز صوتی سسٹم پر ہمہ وقت اس کی تواریخ اور جغرافیہ کا رکارڈ سنایا جارہا تھا۔ چونکہ وہ دن امریکہ کی آزادی کا دن تھا لہٰذا وہائٹ ہاؤس سے قریب ایک میدان میں دو گھنٹے تک ملٹری مشق کے ذریعہ Civilwar میں امریکہ کے جیت کی روداد بھی دکھائی گئی جو بے حد دلچسپ تھی۔ شام میں ہم نے اس واٹر گیٹ ہوٹل کو بھی دیکھا جہاں کی میٹنگ کے بعد صدر نکسن کو استعفا دینا پڑا تھا۔ ان گھیٹوز کو بھی دیکھا جو صرف کالوں کے رہنے کی جگہیں ہیں اور مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح امریکی ثقافت پر چپکے ہوئے ہیں۔ واشنگٹن میں چند لوگ سڑکوں اور لانوں پر اپنی بیٹھک کے سامنے Homeless تختی لگائے بھی نظر آئے۔ ایسے نظارے انسانوں کے لیے سبق آموز بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی جو ہمیں یاد کراتے ہیں کہ عروج و زوال اور تنگ دستی اور تونگری خدا کی دین ہے۔ کب کون اعلیٰ ادنیٰ ہوجائے گا خدا ہی کو معلوم ہے۔

پتہ:
Deptt of Wildlife Sciences,
Muslim University, Aligarh

□□□

آرتی شری واستو

دیہی مینجمنٹ

اگر آپ کی دلچسپی دیہی ترقی اور دیہی عوام کی زندگی سے متعلق مختلف پہلوؤں میں ہے تو آپ اپنا کیریئر دیہی ترقی، دیہی مینجمنٹ اور دیہی مارکٹنگ جیسے میدانوں میں بھی بنا سکتے ہیں۔ ہندوستان دیہاتوں کا ملک کہا جاتا ہے لیکن ملک میں دیہی بازار پر اس قدر توجہ پہلی مرتبہ دی جارہی ہے۔ دیہی علاقوں میں بنیادی اور اعلیٰ قسم کی سہولیات مہیا کرانے پر مرکزی اور صوبائی حکومتیں کافی زور دے رہی ہیں۔ شہرت یافتہ پرائیویٹ کمپنیوں کو بھی اس بات کا بخوبی احساس ہونے لگا ہے کہ ہندوستان کا دیہی بازار کافی بڑا ہے اور اس میں تجارت کے تمام امکانات موجود ہیں۔ معاملہ خواہ دیہاتوں میں صنعت قائم کرنے کا ہو، اشیا اور خدمات فروخت کرنے کا ہو، یا پھر دیہاتوں کے لیے نئی ٹکنالوجی فروغ دینے کا ہو، سبھی میں ان دنوں کافی چہل پہل دیکھنے کو مل رہی ہے۔ جو بھی ہو لیکن دیہاتوں اور دیہی بازاروں پر اس نئی توجہ سے کیریئر کے نئے مواقع ضرور پیدا ہورہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی مینجمنٹ اور مارکیٹنگ کے ماہرین کی ان دنوں خاصی ضرورت درپیش ہے۔ دیہی ضرورتیں شہروں جیسی نہیں ہیں۔ اس لیے ان علاقوں کے لیے منصوبے اور پالیسیاں تیار کرتے وقت ان کی خاصیتوں کا خصوصی طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ اختصاص کا میدان ہے اور ان خصوصیتوں کو حاصل کر کے کیریئر کے بہت سے دروازے کھل جاتے ہیں۔

دیہی ترقی کا کام تعلیم، صحت، انفرااسٹرکچر، خواتین کو مضبوط بنانا اور پانی کی بچت وغیرہ کے میدان میں ہوسکتا ہے۔ مارکٹنگ میں دیہی عوام کے درمیان مصنوعات اور خدمات کو مشتہر کرنا، فروخت کرنا اور نئے خریدار بنانا شامل ہے۔ دیہی مینجمنٹ میں دیہاتوں میں جاری ترقیاتی منصوبوں اور تجارتی مہموں کی نظامت اور ہدایت کاری وغیرہ کرنا ہوتا ہے۔ پراکٹر اینڈ گیمبل، ہندوستان لیور، کولگیٹ اور پامولیو جیسی کثیر قومی کمپنیاں گاؤں میں اپنی مصنوعات فروخت کرنے کے لیے بہتر کوششیں کررہی ہیں۔ آئی ٹی سی نے ملک کے مختلف حصوں کے دیہی علاقوں میں ای چوپال قائم کر کے جس تجربے کی ابتدا کی تھی وہ بہت کامیاب رہا ہے۔

گودریج، مارکو اور نرما وغیرہ کمپنیوں نے بھی اپنا رخ دیہاتوں کی جانب کردیا ہے۔ جیسا کہ میدان میں پچھلے برسوں کئی جدید کمپنیاں، آئی ہیں اور شہروں، قصبوں کے ساتھ ساتھ وہ دیہاتوں میں بھی گاہکوں کو تلاش کررہی ہیں۔ مائکروفائنس کی تجارت بھی گاؤں میں بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ہندوستانی بنکوں اور دوسرے اداروں کے ساتھ کئی غیر ملکی کمپنیاں بھی مائکروفائنس کے میدان میں کام کررہی ہیں۔ خودکفیل اداروں اور این جی او کی سرگرمیوں نے نئے مواقع پیدا کیے ہیں۔ ڈی ایف آئی ڈی، کیئر، ایکشن ایڈ اور آکس فیم جیسی ایجنسیوں نے دیہی علاقوں میں اہم منصوبوں پر بہت کام کیا ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ اس طرح کے کیریئر میں ہمیشہ ہی گاؤں میں کام کرنا پڑے۔ اچھے اداروں سے دیہی نظم ونسق یا متعلقہ کورس مکمل کرنے والے طالب علموں کو کیمپس پلیسمنٹ آسانی سے ملنے لگا ہے۔ اگر وہ ترقی کرنے کے خواہش مند ہیں تو آگے چل کر اعلیٰ سطحی کیریئر بھی اپنا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں مینجمنٹ کی تعلیم دینے والے چند ادارے اپنے پوسٹ گریجویٹ کورسیز میں طالب علموں کو دیہی مینجمنٹ میں خصوصی مطالعے کا موقع فراہم کرتے ہیں لیکن دیہی مینجمنٹ اور اس سے مشابہ مضامین جیسے ایگری بزنس فارسٹری میں خاص کورسیز بھی موجود ہیں۔ ایسے کورسیز کو پڑھانے والے چند اہم اداروں کی فہرست حسب ذیل ہے:

انسٹی ٹیوٹ آف روزل مینجمنٹ، آنند گجرات
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، احمد آباد
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، لکھنؤ
جیویئر انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، بھونیشور
جیویئر انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسیز، رانچی
نرسی مون جی انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اسٹڈیز، ممبئی
آر. این پودار انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، جے پور
جیویئر انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ ایکشن اینڈ اسٹڈیز، جبل پور
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف روزل مینجمنٹ، جے پور
انڈین انسٹی ٹیوٹ آف فارسٹ مینجمنٹ، بھوپال
گووند ولبھ پنت کرشی ایوم پرادھوگکی وشوودیالیہ، پنت نگر
چودھری چرن سنگھ کرشی وشوودیالیہ، حصار
گجرات ودیاپیٹھ، احمد آباد
این آئی ایم ٹی انسٹی ٹیوٹ آف ایگرو بزنس اینڈ روزل مینجمنٹ کوٹ پتلی، جے پور

وی پی شری واستو، اسٹاف ٹریننگ کالج، بنک آف انڈیا، جیل روڈ، اریراہلس، بھوپال-462004

(بشکریہ روزنامہ "ہندوستان"، دہلی 3 اکتوبر 2006)
ہندی سے ترجمہ: محمد عمر رضا

پتہ:
224-E, Mahanadi, Jawaharlal Nehru University,
New Delhi-110067

□□□

سید احتشام حسین

(ہماری مطبوعات سے)

نظیر اکبرآبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقا

اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں جاگیرداری دور کا زوال اور نئی طاقتوں کا طلوع نئے مسائل پیدا کر رہا تھا اور سیاسی تبدیلیوں نے ثقافت کی نشو ونما کو روک دیا تھا۔ اس لیے اس کے کسی حصے میں ترقی نہیں دکھائی پڑتی۔ صرف شاہی دربار اور پایۂ تخت یا اس سے تھوڑا آگے بڑھ کر کچھ خاص خاص شہر ادب، فن اور ثقافت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ایسا ہر ملک میں اور ہر زمانے میں ہوتا ہے۔ زبان اس طرح ادبی ہو کر محدود ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ادب میں بھی کچھ مخصوص باتیں تسلیم کر لی جاتی ہیں اور انھیں توڑنے کی کوشش کرنے والے کو بھی اس کے زمانے میں اہمیت نہیں دی جاتی۔

اردو زبان نے بول چال کی زبان کی صورت میں ترقی کی، مگر جب اس نے ادب میں ایک مقام حاصل کر لیا تو اس کے ناپ تول کے پیمانے بدل گئے اور مرکزوں میں محدود ہو جانے کے باعث اس کا تعلق تھوڑا بہت عامۃ الناس سے ٹوٹ گیا۔ ادب پر تو ضرور ہی اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس وقت سماجی اور اقتصادی زندگی کے اصل دھارے دو تھے: ایک طرف عوام الناس تھے جن میں بیشتر کسان اور نچلے درجہ کے عام لوگ تھے دوسری طرف بادشاہ، جاگیردار، فوج کے بڑے افسر اور دربار سے متعلق لوگ تھے جنھیں اونچا طبقہ کہا جا سکتا ہے۔ متوسط طبقہ ٹھیک سے پیدا نہیں ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ متوسط طبقے میں ہو سکتے تھے وہ بھی دماغی طور پر جاگیردارانہ زندگی سے متاثر تھے۔ اس لیے ادب میں بھی دو رنگ ہو جاتے ہیں جو کبھی کسی بڑے ادیب کی تخلیقات میں وسیع پیمانے پر ملتے دکھائی پڑتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب ادیب صرف اونچے طبقے کے لوگوں کے جذبات کی مصوری کرتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انکا شعور شاہی دور کے خیالات، اخلاقی اصولوں، تعلیم سے متعلق قاعدوں سے بنتا تھا اور وہ انھی روایات کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پھر بھی جہاں کہیں نوع انسانی کی بہبود اور پامال لوگوں کے ساتھ انصاف کا سوال اٹھتا تھا، یہ شاعر سب پابندیوں کو توڑ دیتے تھے۔ وہ مذہب، سیاسی روایات اور معاشی امتیازات کی مخالفت کرتے تھے، کیونکہ انھی کی مدد سے انسان کو طبقوں اور گروہوں میں بانٹا جاتا تھا، یہ باتیں کچھ تو تصوف کی بلند اور وسیع نظر کا نتیجہ کہی جا سکتی ہیں اور کچھ فرد اور سماج کے درمیان اخلاقی تعلق قائم کرنے کی کوشش میں پیدا ہوئیں۔ اس روایت کو چلانے میں سبھی عظیم شعرا کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ، ولی، میر، سراج، درد، آتش، غالب اور دوسرے شعرا اسی روایت کی پیروی کرتے تھے۔ اعلیٰ شعری ادب کی یہ خصوصیت سبھی زبانوں میں پائی جاتی ہے، کیونکہ انسان کے خلاف ناانصافی کا احساس صاحب دل شاعروں کو پہلے ہوتا ہے اور وہ ایک خاص طبقاتی سماج میں رہتے ہوئے بھی عام لوگوں کے ساتھ فراخدلانہ جذبہ ظاہر کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں اچھا عوامی ادب جنم نہیں لے سکا، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اردو زبان کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ہندوستانی ثقافت ایک مخصوص شکل اختیار کر چکی تھی، کئی زبانوں کے ادب رائج تھے اور جب اردو ایک نئی زبان کی شکل میں ابھری تو اس کے سامنے ادب کے جو اچھے نمونے موجود تھے، اس نے انھی کی راہ اختیار کر لی۔ جب تک وہ بول چال کے کام میں لائی جاتی رہی اس نے عوام کے خیالات اور برتاؤ کی بنیاد پر ترقی کی اور بہت سے محاورے جو زندگی کے عام معمول سے تعلق رکھتے تھے، رائج ہو گئے۔ ابتدائی حالت میں اردو ادب میں سادگی تھی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ادبی زبان میں فارسی عربی الفاظ سے مدد لی جانے لگی اور زیادہ تر ان خیالات کا چرچا ہونے لگا جو ہندوستانی عوامی زندگی کے مزاج سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے تھے۔ دیہی اور شہری زندگی میں فرق پیدا ہو چکا تھا اور شہروں میں بھی لوگ اپنے ہی طبقے کے لوگوں سے ملتے تھے اور اس بات کو اپنی آن بان کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتے تھے، اس طرح اردو شاعری عوامی ادب سے دور ہوتی چلی گئی۔ اردو کے بیشتر شاعر صرف فارسی زبان اور اس کے اصول شاعری کے واقف کار تھے، بلکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو فارسی کو اردو سے برتر سمجھتے تھے اور اسی زبان میں لکھنے کو تہذیب کی علامت جانتے تھے۔ ان میں سے کچھ ہندی سے بھی واقف تھے، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندی اصول شاعری کے عالم تھے اس لیے وہ اپنی شاعری میں فارسی کے اصول شاعری اور اصول تنقید سے استفادہ کرتے تھے۔ فارسی کی تنقید شاعری پر ارسطو کا گہرا اثر پڑا تھا اور اسی کی وجہ سے فارسی نقاد بھی اس اصول کو ماننے لگے تھے کہ شاعری اور تاریخ میں پیش ہونے والے واقعات میں فرق ہونا چاہیے۔ تاریخ میں خاص واقعات کا بیان

"اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ" سے ماخوذ، از: سیّد احتشام حسین، صفحات۔ 341، قیمت : -/66

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ہوگا اور شاعری میں عمومی حیثیت کے اور عام واقعات کا، یہی سبب ہے کہ غزل میں، جو اردو اور فارسی کے شعری ادب کی سب سے ہر دل عزیز ہیئت ہے، ایسے جذبات اور احساسات کا بیان ہوتا ہے، جو ایک ہی طرح کے بہت سے واقعات پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ اردو شاعری کی اس خصوصیت کو دھیان میں رکھنے سے کئی باتوں کے سمجھنے میں مدد ملے گی اور یہ بات بھی واضح ہو سکے گی کہ خاص واقعات اور مسائل پر زیادہ نظمیں کیوں نہیں لکھی گئیں۔ شاعری کو زیادہ سے زیادہ عالمگیر اور آفاقی ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے یہ راہ پکڑی تھی۔ اس کے سماجی اور اقتصادی اسباب کا سمجھنا کچھ ایسا دشوار نہیں ہے مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بہت سے شاعر پوری طرح عوام کی عام زندگی سے واقف بھی نہ تھے۔ جن کو اس کا تھوڑا بہت تجربہ تھا اور جس طرح کا تجربہ تھا اس کا ذکر انھوں نے کسی نہ کسی طرح سے ضرور کیا ہے۔

ایسے ہی ایک شاعر نظیر اکبرآبادی ہیں جو اپنا کوئی مثل نہیں رکھتے۔ نظیر کی پیدائش دلی میں 1740 کے قریب ہوئی مگر ان کی پوری زندگی آگرہ (اکبر آباد) میں گزری، وہی آگرہ جو مغل شہنشاہ اکبر کی راجدھانی رہ چکا تھا اور جس کی چاروں طرف کرشن بھگتی کی وہ ویشنو تحریک پھیلی ہوئی تھی جس نے سورداس اور میرابائی کے گیتوں اور بھجنوں کو جنم دیا تھا، جہاں عظیم الشان قلعہ اور تاج محل کھڑے کیے گئے تھے۔ یہاں کی ہوا میں رادھا اور کرشن کی محبت اور بھگتی کے گیت گونج رہے تھے، جہاں سے قریب متھرا اور برندرابن کے میلوں اور تہواروں میں شریک ہوکر عوام کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ ان روایات کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نئے معاشی حالات کے زیر اثر ہندوستان غریب ہوتا جارہا تھا، تاجر اور اہل حرفہ بیکار ہو رہے تھے، ملک کی دولت سمندر پار جارہی تھی اور وہی زندگی کا وہ ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا جو صدیوں سے ملک کی زندگی کو باندھے ہوئے تھا۔ نظیر اکبرآبادی کی عمر اسی آگرے میں کٹی جس کے ذرہ ذرہ سے انھیں محبت تھی خود کہتے ہیں:

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے
ملا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے
شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

اس لیے ان کی شاعری میں وہی زندگی سانس لیتی معلوم ہوتی ہے، جو آگرے میں اور اس کے چاروں طرف تھی۔

نظیر کا نام ولی محمد تھا۔ حسب رواج انھوں نے فارسی عربی پڑھی تھی مگر انھیں ان زبانوں کا بڑا عالم نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ لڑکوں کے پڑھانے میں گزارا۔ آخر میں لالہ بلاس رائے کے لڑکوں کو سترہ روپے ماہوار پر فارسی پڑھانے لگے تھے۔ ایک وقت کا کھانا انھی کے یہاں کھاتے تھے۔ جوانی میں زندگی کے عیش و آرام، تفریح اور مذاق سب میں حصہ لیا تھا، کھیل کود، کنکوے بازی، تیراکی، کسرت کشتی، کبوتر بازی سبھی دلچسپیوں سے جی بہلاتے رہے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہواروں خاص کر ہولی، دیوالی، راکھی، کرشن جنم میں ضرور حصہ لیتے تھے۔ بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اودھ اور بھرت پور کے شاہی درباروں سے دعوت نامے ملے مگر انھوں نے آگرے کو چھوڑنا منظور نہیں کیا اور نفع یا سکون کی زندگی کو ٹھکرا دیا۔ دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی قربانی ہے مگر درحقیقت یہ عوامی زندگی سے محبت اور وہ وابستگی ہے جو دربار سے بندھ جانے کے بعد ختم ہو جاتی۔

نظیر نے ایک طویل عمر پائی۔ اس میں انھوں نے آرام بھی اٹھایا اور زندگی کے دکھ بھی سہے۔ اس میں وہ محبت کی پینگوں میں بھی جھولے اور فقیروں کی ایسی زندگی بھی گزاری۔ آگرے کے بڑے بڑے لوگ ان کی توقیر و تعظیم کرتے تھے اور استحصال کا شکار مختلف طبقات کے عوام سے بھی ان کا یارانہ تھا۔ یہ تعلق اتنا مضبوط تھا کہ ان کے یہاں اونچ نیچ، ہندو مسلم، چھوٹے بڑے کا امتیاز مٹ گیا تھا۔ ان کے مزاج میں ایسی سادگی اور برتاؤ میں ایسی بے ریائی پائی جاتی تھی کہ سبھی ان کے دوست تھے۔ بھکاری اور خوانچے والے بھی ان سے اپنے لیے نظمیں لکھا لیتے تھے۔ آگرہ کے محلہ تاج گنج میں رہتے تھے۔ وہیں 1830 میں ان کی وفات ہوئی اور گھر ہی کے اندر ان کی قبر بنی۔ نظیر ایسے خدا پرست تھے کہ ان کی وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے انھیں بڑا صوفی فقیر سمجھا اور بہت دنوں تک ان کی قبر پر ہر سال میلہ لگتا رہا۔ ان کے بیٹے خلیفہ گلزار علی اسیر بھی شاعر تھے۔ کئی شاگرد بھی تھے جن میں باطن کو شہرت حاصل ہے، انھوں نے شعرا کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا جس میں نظیر کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے کیونکہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے انھیں بازاری شاعر سمجھ کر نظرانداز کیا تھا۔

نظیر کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ایک میں ان کی نظمیں ہیں اور اس کا نام کلیات نظیر ہے۔ یہ دیوان بار بار چھپ چکا ہے۔ ہندی میں بھی اس کے کچھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرا دیوان ابھی کچھ برس پہلے دستیاب ہوا۔ اس میں صرف غزلیں ہیں۔ اسے بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ ابھی ان کی بہت سی نظمیں لوگوں کے پاس ادھر ادھر ہیں۔ مگر یقینی طور سے اس بارے میں کچھ کہنا ناممکن ہے۔ دوسرا مجموعہ ملنے سے یہ تو ہوا کہ ہم نظیر کی غزلوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں مگر آج بھی انھیں ہندوستانی ادبیات میں جو عظمت حاصل ہے وہ نظموں ہی کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس میں ہندوستانی زندگی اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ جی اٹھی ہے۔ اس کلیات کا ایک حصہ کرشن جی، مہادیو جی، بھیروں جی وغیرہ پر لکھی ہوئی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔ نظیر سے پہلے زیادہ تر شعرا عام موضوعات پر لکھنے اور عوام کی زندگی کی تصویر کشی کرنے میں ہچکتے تھے مگر نظیر نے اونچے طبقے کے خیالات میں ایک ایسا چور دروازہ بنا دیا جس میں سے ہوکر عوام کا جلوس قصر ادب میں گھس آیا۔

شاعری کی اس عظیم روایت کے ساتھ نظیر اکبر آبادی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اصل میں تو یہ وہی روایت تھی جسے امیر خسرو نے جنم دیا تھا مگر درمیان میں زندگی سے اس کا وہ پہلا سا گہرا تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ نظیر نے اسے مستحکم وسیع اور مقبول عام بنایا۔ امیر خسرو کے بعد صوفی شعرا نے گولکنڈہ کے قلی قطب شاہ نے جعفر زٹلی نے دلی کے فائز اور حاتم نے اسے ہلاکت سے بچایا تھا۔ نظیر نے اسے آسمان تک بلند کر دیا۔ ایک ہندی ادیب نے نظیر کی فراخدلی اور اردو ادب کی ایک نئی روایت نکالنے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''......اس خشک اور اجاڑ سنگم پر آکر نظیر نے اذان بھی دی اور سنکھ بھی پھونکا۔ تسبیح بھی لی اور جنیو بھی پہنا، محرم میں روئے تو ہولی میں بھانڈ بھی بنے، رمضان میں روزے رکھے تو سلونوں پر راکھی باندھنے کو مچل پڑے، شبرات پر مہتابیاں چھوڑیں تو دیوالی پر دیپ سجائے، نبی، رسول، ولی، پیر، پیغمبر کے لیے جی بھر کے لکھا، تو کرشن، مہادیو، نرسی، بھیروں اور نانک کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ گل و بلبل پر کہا تو آم اور کوئل کو پہلے یاد رکھا۔ پردے کے ساتھ بسنتی ساڑھی بھی یاد رہی۔ اور تو اور گرمی، برسات اور سردی پر بھی لکھا۔ بچوں کے لیے ریچھ کا بچہ، لڈو اور ہرن، گلہری کا بچہ، تربوز، کنکوے بازی، بلبلوں کی لڑائی، ککڑی، تیراکی، تل کے لڈوؤں پر لکھنے بیٹھے تو بچہ بن گئے ہر ایک بچہ گلی کوچے میں گاتا پھر رہا ہے۔ جوانوں اور بوڑھوں کو پند دینے بیٹھے تو لوگ وجد میں آگئے۔ جیسے قرآن حدیث، وید، گیتا، اپنشد، پران، سب گھول کر پی جانے والا کوئی پہنچا ہوا بزرگ بول رہا ہو۔''

(شعر و شاعری مصنف ایودھیا پرشاد گوئیلیہ 1948)

یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ نظیر کے یہاں اردو شاعری کی وہ روایات بالکل نہیں ہیں جنھیں سامنتی تہذیب اور ایرانی اثرات نے جنم دیا تھا اور نہ یہی کہنا ٹھیک ہوگا کہ دور حاضر کی حقیقت پسندی اور قومی شعور کا آغاز نظیر کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں ناممکن تھیں مگر ان کی شاعری میں جو سچائی، جو وطن پرستی، عام زندگی کی جو واقفیت انسان کی جو محبت، جو وسعت قلب اور جو سادگی ملتی ہے وہ اس سے پہلے کسی شاعر کے یہاں نہیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم قدم جمائے زمین پر کھڑے ہیں، ہمارے چاروں طرف انسان بے کھٹکے چل پھر رہے ہیں، اپنے دیس کے جاڑے، گرمی، برسات آتے ہیں اور ہم ان جانے بوجھے موسموں کا لطف اٹھانے لگتے ہیں۔ الگ الگ گروہوں اور ذاتوں کے لوگ متعدد مذہبوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے، جانور، چڑیاں سب موجود ہیں اور ساری فضا وہ ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ ان چھوٹے موضوعات پر زندہ نظمیں لکھنا کسی معمولی یا چھوٹے شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جس کا دل ہمدردی سے لبریز، مشاہدہ گہرا اور عام زندگی کا احساس قوی ہو۔ نظیر میں یہ ساری باتیں موجود تھیں۔ نظیر کے تجربے کا میدان اتنا وسیع ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی کے بارے میں سبھی کچھ جانتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ نظیر کے پاس کوئی عمیق فلسفیانہ نظر نہیں ہے مگر وہ زندگی کے مسائل میں اس طرح رچے بسے ہوئے ہیں کہ انھیں سب باتیں اپنے آپ معلوم ہیں۔ وہ مفلسی کے اسباب، زندگی اور مذہب کے تعلق، طبقات کے اختلاف، انسانیت کی ضروریات سب کچھ جانتے ہیں اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی سیدھی سادھی نظموں میں یہ تمام باتیں کیسے آگئی ہیں۔ جب وہ برسات، آندھی، اندھیری رات آٹا دال، تیراکی وغیرہ پر لکھتے ہیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ باتیں ان کے منہ سے نکل رہی ہیں بلکہ ان کو انھوں نے ہر موقع اور ہر نگاہ سے دیکھا ہے انھوں نے زندگی کو جیسا دیکھا اور پایا تھا ویسی ہی اس کی مصوری کر دی، لیکن ہر شکل پر ان کا نقطۂ نظر عوام کا نقطۂ نظر رہا ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ وہ ملک کے معاشی مسائل کو سائنسی طریقے سے نہیں جانتے تھے، طبقات کے داخلی تصادم کا کوئی خاص علم نہیں رکھتے تھے مگر ایک سچے انسان دوست ہونے کے باعث وہ عوام کے دکھ سکھ کا اندازہ لگا لیتے تھے کیونکہ وہ انھیں میں سے ایک تھے۔

نظیر کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت ان کی زبان پر خاص طور سے توجہ کرنی چاہیے کیونکہ ان کی زبان آگرہ کی بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے۔ اس میں کہیں کہیں کھڑی بولی اور برج کا میل ہے۔ ایک آدھ نظموں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی، فارسی کے علاوہ اودھی اور پنجابی بھی جانتے تھے۔ اختصار کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام عظیم شعرا کی طرح زبان کا استعمال نظیر کی شخصیت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ فن کی نظر سے ان کی شاعری میں نقائص ہیں، تخیل کی نظر سے طرح طرح کی سخت ناہمواریاں ہیں مگر ان کی صداقت اور انسان دوستی سب پر پردہ ڈال دیتی ہے اور ان کی نظمیں پڑھتے ہوئے بند اور رندھے ہوئے ماحول سے نکل کر ہم کھلی ہوا میں آجاتے ہیں۔ نمونے کے لیے کچھ نظموں کے اجزا دیے جاتے ہیں:

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی

پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
(آدمی نامہ)

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے، یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے پھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جو ایک بار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ
آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ
وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار
دیتے تھے سب کو نقد سو، کھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں آڑے ہے پڑی خاک بیشمار
بیٹھے ہیں یوں دکانوں پر اپنی دکاندار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

قسمت سے چار پیسے جنھیں ہاتھ آتے ہیں
البتہ روکھی سوکھی وہ روٹی پکاتے ہیں
جو خالی ہاتھ آتے ہیں وہ قرض لے کے جاتے ہیں
یوں بھی نہ پایا کچھ تو فقط غم کو کھاتے ہیں
سوتے ہیں کر کواڑ کو اک آہ مار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات
سب پر پڑی ہے آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو رویئے اور کس کی کہیے بات
روزی کے اب درخت کا ملتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آکے ہوئی ایک بار بند
(شہر آشوب)

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ اک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی
(مفلسی)

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دو بالا ہوتا ہے
سب بات بیتھا کی بھولے ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند منڈلی باجت ہے نت بھون اجالا ہوتا ہے
یوں نیک نچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر ان کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم
شبھ ساعت سے یوں دنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں
جو نارو منی ہے دھیان بھلی سب اس کا بھید بتاتے ہیں
وہ نیک مہورت سے جس دم اس سرشٹ میں جنمے جاتے ہیں
جو لیلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ دکھلا جاتے ہیں
یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں
پر بالے ہی پن میں ان کے اپکار نرالے ہوتے ہیں
(جنم کنھیا)

نظیر نے اپنا طرز سب سے الگ نکالا، وہ نہ دلی کے مرکز میں رکھے جاسکتے ہیں اور نہ لکھنؤ کے مرکز میں، وہ خود نئی روش کے موجد ہیں اور کسی بنے بنائے راستے پر چلنے کے بجائے اپنی راہ آپ بنانے والے۔ یہ خصوصیت انھیں اس لیے حاصل ہوئی تھی کہ انھوں نے زندگی کے سمجھنے میں کسی فلسفے یا روایت کا سہارا نہیں لیا بلکہ اس میں خود ڈوب گئے اور وہ لکھا جو کسی اور نے نہیں لکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وقت میں نقادوں نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی اور وہ طرز رائج نہ ہوسکا جسے نظیر نے اپنایا تھا۔ مگر آج ان کا اثر تسلیم کیا جارہا ہے۔ اردو کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی اور مشہور شاعر احسان دانش صرف ان کی بڑائی کو ہی نہیں مانتے بلکہ ان سے متاثر بھی ہیں۔ آج کے نقاد بھی قدیم تذکرہ نویسوں کے برعکس انھیں بلند مقام دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جدید نقطۂ نظر سے شاعری اور زندگی میں جس رشتے کی تلاش کی جارہی ہے اس کے خوبصورت نمونے نظیر کے یہاں ملتے ہیں اور وہ روایت درخشاں ہوکر راہ نمائی کرتی ہے جس پر چلے بغیر ادب ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود ہوکر رہ جاتا ہے۔

□□□

اردو خبرنامہ

اردو خالص ہندوستانی وراثت ہے ـــ ارجن سنگھ

● نئی دہلی، 10 جولائی۔ قومی اردو کونسل کی سالانہ میٹنگ میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے، جو کونسل کے چیئرمین بھی ہیں، اردو کی ہندوستانی وراثت پر خصوصی زور دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کوئی غیر ملکی زبان نہیں ہے بلکہ ہماری مشترکہ تہذیبی وراثت ہے۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس کو کسی خاص مذہب یا فرقے سے نہیں جوڑا جانا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ موجودہ حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے ہر طرح کے اقدامات کی پابند ہے اور اس کو وہ تمام تحفظات اور تعاون ملنا چاہیے جو ہندی کو حاصل ہے۔ اردو کو ہندی کی رقیب کی طرح نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ دونوں زبانوں میں کوئی نفاق نہیں ہے۔ زبانیں تبھی فروغ پاتی ہیں جب وہ دوسری زبانوں کے رابطے میں آتی ہیں اور باہمی طور پر جذب وقبول کے عمل سے گزرتی ہیں۔

کونسل میں یہ بات بھی طے ہوئی کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں اردو کے تہذیبی مراکز قائم کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں سے رابطہ قائم کر کے درخواست کی گئی ہے کہ وہ کونسل کے لیے زمین فراہم کریں تاکہ ان ریاستوں کی راجدھانیوں میں اس قسم کے تہذیبی مراکز قائم کیے جاسکیں۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے یہ اطلاع دی کہ ہم ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے 150 سال منارہے ہیں، ایسے میں کونسل کے پیش نظر بہت سے پروگرام ہیں۔ اس بات پر خصوصی زور دیا گیا کہ انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لیے اردو نے ملک بھر میں عوام کو متحد کرنے کا کام کیا تھا۔ آزادی کی پہلی جنگ کے رہنما اردو کے عظیم شاعر بہادر شاہ ظفر تھے۔ اس موقع پر عزت مآب جناب ارجن سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ دہلی میں پہلی جنگِ آزادی کے قائدین کی یادگار قائم کی جائے گی جس میں اہم دستاویزات اور رکارڈ محفوظ کیے جائیں گے تاکہ آئندہ نسلیں ان سے استفادہ کریں۔ اس جانب بھی توجہ دلائی گئی کہ بیگم حضرت محل کا مزار بہت خستہ حالت میں ہے، حکومتِ ہند کو چاہیے کہ وہ پہل قدمی کرتے ہوئے حکومتِ نیپال سے رابطہ قائم کرے اور وہاں بیگم حضرت محل کی یادگار قائم کی جائے۔

کونسل نے 1857 کی جنگِ آزادی کے 150 سال گزرنے کے موقع پر ایک بڑا قومی سیمینار کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے تاکہ اس جنگ آزادی میں اردو کے شاندار کردار کو اجاگر کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ایک عالمی کانفرنس خلیجی ممالک میں منعقد کرنے کی بھی تجویز رکھی گئی جہاں اردو دانوں کی ایک بڑی آبادی رہتی ہے۔ اس تجویز کا عزت مآب ارجن سنگھ صاحب نے خیر مقدم کیا اور کونسل کو اس سلسلے میں اقدامات کرنے کی ہدایت کی۔ یہ کانفرنس مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے تعاون سے منعقد کی جائے گی۔

اطلاعاً عرض ہے کہ قومی اردو کونسل 1994 میں وجود میں آئی تھی، اس سے قبل اس کی جگہ بیورو برموشن آف اردو نام کا ادارہ قائم تھا۔ بیورو 73 کارکنان پر مشتمل تھی لیکن کونسل کے قیام کے وقت ان کی تعداد خاصی گھٹ گئی تھی۔ کونسل کی میٹنگ میں یہ بھی تجویز رکھی گئی کہ اگر کونسل کے مراکز پورے ملک میں کھولے جائیں گے تو پھر اس کے کارکنان کی تعداد میں اضافہ ناگزیر ہوگا۔ اس سلسلے میں کونسل کے چیئرمین نے کونسل کی ازسرنو تشکیل کی بات کہی اور ہدایت دی کہ متعلقہ کمیٹیوں کے ذریعے اس تجویز کو پیش کیا جائے تاکہ اس سلسلے میں مثبت کارروائی کی جاسکے۔ (پریس ریلیز، قومی اردو کونسل)

مرکزی حکومت کا اعلان لائق ستائش

● سہارنپور، 15 جولائی۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن اتر پردیش کی ضلعی شاخ نے فروغ انسانی وسائل کے وزیر جناب ارجن سنگھ کے اس اعلان کو سراہا ہے کہ مرکزی حکومت عالمی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے اقدامات کرے گی اور اسے ہندی کے مساوی درجہ دلانے کی کوشش کرے گی۔ ایسوسی ایشن نے اس اعلان کو لائق تحسین قرار دیا ہے۔

یہاں ایسوسی ایشن کی ایک ہنگامی میٹنگ میں اردو اساتذہ نے واضح طور پر کہا کہ اردو ملک کے تمام باشندوں کی زبان ہے۔ جو لوگ اردو پر صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا لیبل چسپاں کرتے ہیں وہ ناسمجھ اور اردو کے دشمن ہیں۔ میٹنگ میں موجودہ بی ایس پی سرکار کی اردو کے تئیں بے رخی اور بے اعتنائی پر بھی افسوس کا اظہار کیا گیا اور ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ 88 ہزار پرائمری اساتذہ کی تقرری میں اردو اساتذہ کے تقرر کو بھی یقینی بنایا جائے اور معلم اردو کی سند کو بی ٹی سی کے مساوی درجہ دے کر ان کی تقرری کی جائے۔ علاوہ ازیں اردو میڈیم اسکول قائم کیے جائیں اور جن اسکولوں میں

مسلم پس ماندہ برادریوں کے بچے زیر تعلیم ہیں، ان سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن نے اسکولوں میں جنسی تعلیم کی بھی مخالفت کی اور اس کو ہندوستان کی اخلاقی اقدار کے منافی بتایا۔ میٹنگ کی صدارت راؤ عبدالستار نے اور نظامت شمشاد قمر نے کی۔ شرکت کرنے والوں میں نعیم احمد طالب، تسنیم احمد، عادل عقیل، شہرشاہ اعظم اور چاندمیاں انصاری وغیرہ نمایاں تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی معتبر ترجمان ہے

● کانپور، 20جون۔ کانپور کمشنری کی اردو کانفرنس کا انعقاد یہاں مرچنٹ چیمبر ہال میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور جگر اکادمی کانپور کے اشتراک سے کیا گیا جس کی صدارت صنعت کار ارشاد مرزا نے کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر خان احمد فاروق نے انجام دیے۔ مقالہ نگاروں نے اردو کے ہمہ جہت اوصاف اور خوبیوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ صورتحال پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر عشرت صدیقی نے اپنے مقالے میں کہا کہ آزادیِ ہند کے جلو میں بدقسمتی سے سیاسی انقلاب کے ساتھ لسانی انقلاب بھی در آیا۔ حالات اچانک ایسے بدلے کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بنا کر رکھ دیا گیا جس کے سبب اردو کو وہ عزت نہ ملی جس کی وہ مستحق تھی۔ عصبیت کی چکاچوندھ میں اس زبان کا وہ کردار بھی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا جو ہندوستان خصوصاً اتر پردیش کی تہذیب وثقافت کی تاریخ میں اس نے ادا کیا تھا۔ آزادی کے بعد اردو قومی زبان بننے سے محروم رہی۔ اس زبان کو فرقہ وارانہ نظریے سے دیکھا گیا۔ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی پلی بڑھی اور فروغ پائی۔ اردو ہندو مسلم کی مشترکہ زبان ہے اور مشترکہ زبان رہے گی۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہے۔ اردو کئی سو برس سے ہماری گنگا جمنی تہذیب کی معتبر ترجمان ہے بلکہ اب تو اردو اپنے ہمہ جہت اوصاف او رخوبیوں کے سبب الگ الگ زبانیں بولنے والے کروڑوں عوام کے درمیان رابطے کی زبان بن چکی ہے۔ گزشتہ برس 14اگست کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں وزیر اطلاعات ونشریات مسٹر پریہ رنجن داس منشی نے دوردرشن کے اردو چینل کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ اردو ہندوستان کی ایک اہم زبان ہے جسے 5 کروڑ 20لاکھ ہندوستانیوں نے اپنی مادری زبان قرار دیا ہے۔ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ جنوب میں کرناٹک سے آندھراپردیش، شمال میں اترانچل سے لداخ تک، مشرق میں جھارکھنڈ سے بہار تک اس زبان کا چلن ہے۔ اردو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہے۔ دہلی بہار اور اتر پردیش میں یہ دوسری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعری، طنز ومزاح اور صوفیانہ ادب سمیت اردو کی مختلف اصناف نے ہندوستان کی ادبی وثقافتی تاریخ کو مالا مال کیا ہے۔ یقیناً اردو زندہ وسرسبز ہے۔ اسکولوں کالجوں اور دفتروں میں بھی چلن عام ہے۔ وہاں اردو زبان وادب کے پرستار وعموماً مسلمانوں کے ساتھ ہندو عوام بھی ہیں جب کہ دوسری ریاستوں میں اردو مدرسوں اور لائبریریوں کے دم سے ہی زندہ ہے۔ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ 2000 میں دیا گیا لیکن یہ مسئلہ آج تک فائلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ عمل کب ہوگا کسی کو خبر نہیں۔ اردو زبان کے تمام معاملات سردخانے میں ڈال دیے جاتے ہیں۔

جہاں تک اتر پردیش میں اردو کی صورت حال کا سوال ہے اگرچہ اتر پردیش میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیئے ہوئے 18 برس ہوچکے ہیں لیکن اب تک ریاست میں اتر پردیش سرکاری زبان ایکٹ مجریہ 1989 پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ ہر چند کہ اس ایکٹ پر عمل درآمد کرانے کے لیے متعدد مواقع پر آوازیں اٹھائی جاتی رہیں لیکن کسی حکومت نے اسے لائق تحفظ نہیں سمجھا۔ اگر سرکاری زبان ایکٹ مجریہ 1989 پر عمل درآمد ہوجاتا تو ریاست کے تمام اہم سرکاری دستاویزات، حکم نامے، عوامی اہمیت کے حامل فارم اور قوانین ہندی کے ساتھ اردو میں بھی عوام کو مہیا ہوجاتے بلکہ ریاستی ایوان قانون ساز کی کارروائی بھی اردو میں مل جاتی اور اردوداں اپنے منتخب نمائندوں کی جانب سے ایوان میں اٹھائے گئے سوالات اور ان کے جوابات کو بھی پڑھ سکتے لیکن اب تو لینگویج سکشن میں اردو کے مترجم بھی باقی نہیں۔ جو لوگ سبکدوش ہوگئے ان کی خالی جگہیں بھی پر نہیں کی گئیں۔ اردو کے فروغ وترقی کے نام پر اردو ٹیچروں کی بھرتی ضرور کی گئی لیکن اگر شہروں کے پرائمری اسکولوں کو چھوڑ کر دیہی علاقوں میں بیشتر اردو اساتذہ اردو کی بجائے دوسرے مضامین پڑھانے پر مجبور ہیں۔ اردو کی نصابی کتابوں کی فراہمی کا بھی مسئلہ ہے۔ معیاری کتابیں میسر نہیں۔ ہندی سے ترجمہ کی گئی کتابیں زبان کی صحت کے اعتبار سے بھی درست نہیں ہوئیں۔ اکثر یہ کتابیں تعلیمی سال کے آخری دنوں میں ہی دستیاب کرائی جاتی ہیں۔ وہ طلبہ وطالبات جن کی مادری زبان اردو ہے اردو ٹیچر اور کتابوں کے بغیر تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں جبکہ ان پرائمری اسکولوں میں نئی نسل کو اردو زبان کی تعلیم دیے بغیر اردو کا مستقبل روشن نہیں ہوسکتا۔ یہی حال اردو مترجم کی حیثیت سے تعینات کیے گئے سرکاری دفاتر میں ملازمین کا ہے۔ اردو کی درخواست کا جواب اردو میں نہیں ملتا۔ سرکاری دفاتر اور اس کے محکموں میں اردو کی تختیوں اور سائن بورڈوں پر لکھی اردو کا املا تک درست نہیں ہوتا۔ اردو بی ٹی سی اور اردو مترجمین کی اسامیوں پر ایسے لوگ

بھی بھرتی ہوگئے جو اردو میں اپنا نام تک بھی نہیں لکھ سکتے۔

خان احمد فاروق نے اردو کی بین الاقوامی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو پوری دنیا میں مقبول ہے اور اس کا کسی ایک فرقے سے تعلق نہیں ہے۔ حکیم حبیب الرحمٰن صدیقی نے کانپور کمشنری میں اردو کی صورتحال بیان کی۔ کنوینر عشرت ظفر، اردو اکادمی کے سکریٹری اظہر علی خاں، مصباح الحق ایڈوکیٹ، شاعر فتح پوری، عبدالحمید شیخ، سید ابوالبرکات نظمی، سید ابوالحسنات حنفی، عتیق فتح پوری، محمد وسیم اور مشیر صدیقی وغیرہ موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے کمربستہ: مایاوتی

● لکھنؤ، 17 جون۔ اترپردیش کی وزیراعلیٰ مایاوتی نے کہا کہ حکومت کی پالیسیوں، پروگراموں اور مفاد عامہ سے وابستہ تمام اطلاعات کو عوام تک پہنچانے میں سرکاری اشاعتوں کا اہم کردار ہے۔ محکمۂ اطلاعات کی جانب سے شائع ''نیا دور'' کا یہ انقلاب-1857 خصوصی شمارہ اترپردیش کی جنگ آزادی کے مختلف پہلوؤں کو عوام کے سامنے پیش کرکے ملک کے سپوتوں کے ایثار، قربانی اور تعاون کو نوجوان نسل تک پہنچانے میں کامیاب ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ خاص نمبر اترپردیش کے شاندار ماضی، سماجی ایکتا، ہندومسلم بھائی چارے اور گنگا جمنی تہذیب کو مزید استحکام بخشے گا۔ وزیراعلیٰ آج اپنی رہائش گاہ پر ایک سادہ تقریب کے دوران محکمۂ اطلاعات کی جانب سے شائع کردہ اس تاریخی دستاویز کا اجرا کررہی تھیں۔ انھوں نے اس خصوصی شمارے کو معیاری اور تاریخی بنانے کے لیے ڈائرکٹر اطلاعات اور مجلس ادارت کو مبارکباد دی۔ وزیراعلیٰ مایاوتی نے کہا کہ 1857 کے انقلاب کی چنگاری کے پہلے مرحلے کے دوران مذہبی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارے کی جو جھلک دکھائی پڑی تھی اسے منگل پانڈے، بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، رانی لکشمی بائی، جھلکاری بائی، اودا دیوی، نانا صاحب پیشوا اور تاتیا ٹوپے جیسے متعدد بہادر سپوتوں نے آگے بڑھاتے ہوئے ملک کی آزادی کی بنیاد رکھی۔ مہاتما جیوتی باپھولے، چھترپتی شاہو جی مہاراج، نرائن گرو اور پیری یار جی نے اس تحریک کو نئی سمت عطا کی۔ ان عظیم ہستیوں کو بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے پروان چڑھایا اور ان کے بعد کانشی رام جی کی انتھک کوششوں سے صدیوں سے استحصال زدہ طبقوں کو سیاسی طاقت حاصل ہوئی۔ موجودہ اترپردیش کی حکومت انھی عظیم ہستیوں کی جدوجہد سے ترغیب حاصل کرکے مساوات پر مبنی سماج کے قیام کی سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اسکولوں کے مسائل پر میٹنگ

● نئی دہلی، 13 جون۔ دہلی کے اردو اسکولوں کے مسائل کے سلسلے میں آج دہلی اقلیتی کمیشن میں اردو میڈیم اسکولوں کے پرنسپل اور دیگر ذمے داران وعہدیداران کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال احمد فاروقی نے کی۔ میٹنگ میں اقلیتی کمیشن کو بتایا گیا کہ دہلی کے اردو اسکولوں میں کلاس ایک سے کلاس 12ویں تک 88 اردو کتابوں میں سے 76 کتابیں بازار میں دستیاب نہیں ہیں۔ جس کے لیے براہ راست ایس سی ای آر ٹی اور این سی ای آر ٹی دونوں تنظیمیں ذمے دار ہیں۔ فرینڈس فار ایجوکیشن کے چیئرمین فیروز بخت احمد نے کہا کہ دہلی اقلیتی کمیشن کو چاہیے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے تاکہ وقت پر نصابی کتب طلبہ کو فراہم ہوسکیں۔ کارپوریشن اسکول کے سابق استاد مشرف حسین نے دہلی کارپوریشن کے ایجوکیشن ڈائرکٹر کی رپورٹ دکھاتے ہوئے کہا کہ کسی اسکول میں 6 بچوں کے اردو/ پنجابی پڑھنے والوں کی بنیاد پر ایک ٹیچر کی تقرری کی جاسکتی ہے لیکن اس رپورٹ کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ اس وقت 1860 میونسپل کارپوریشن اسکولوں میں 77 اردو اسکول ہیں جن میں 10 لاکھ بچے پڑھتے ہیں۔ جب کہ مسلم بچوں کی تعداد 1.5 لاکھ ہے۔ سروودیہ بال ودّیالیہ پٹودی ہاؤس کے سابق ہیڈ ماسٹر حشام الدین نے کہا کہ 77 اردو اسکولوں میں صرف 35 اسکولوں میں اردو جاننے والے ہیڈ ماسٹر ہیں باقی اردو سے نابلد ہیں جس سے داخلوں کے وقت بچوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ میٹنگ میں اسکولوں کے نمائندگان نے اپیل کی کہ ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ میں ایک اردو سیل بنایا جائے جو ان اسکولوں کے مسائل کو دیکھ سکے۔ اس کے علاوہ اردو میڈیم اسکولوں کا ایک جوائنٹ بورڈ بنانے کے منصوبے کے ساتھ اردو اسکولوں میں خالی عہدوں کو بھرنے کی بھی سرکار سے اپیل کی گئی ہے۔

میٹنگ میں دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال احمد فاروقی، سکریٹری کے. ایس. واہی کے علاوہ ہاشم الدین، مشرف حسین، عبدالحنان چاندنہ، سید فرید احمد، عابدہ قدیر، ڈاکٹر محمد معروف خاں، ڈاکٹر تسلیم احمد رحمانی، خالد نذیر، اختر الزماں، مشتاق بیگ، سعید اللہ صدیقی، ڈاکٹر شبانہ نذیر، راغب الدین، سروج شرما، عبدالمالک، خرم رضا، جمشید عثمانی، ماسٹر مقصود احمد، محبت علی، فیروز بخت احمد، اقبال احمد ملک، جمیل الرحمٰن، گوہر سلطانہ، ڈاکٹر قاسم رسول الیاسی، مرغوب حیدر، محمد تقی، عالیہ بیگم، ٹی سی شرما، ایس ایچ رحمٰن ودیگر نمائندوں نے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کی روٹی کھانے والے اردو سے دور

● گوپال گنج، 18 جون۔ جو لوگ اردو کی روٹی کھاتے ہیں اردو کے نام پر پیسہ پاتے ہیں وہی اردو سے کوسوں دور ہیں جو انتہائی افسوس کا مقام ہے۔ مذکورہ باتیں وزیر تعمیرات عامہ حکومت بہار مناظر حسن نے انجمن ترقی اردو گوپال گنج کے زیر اہتمام عبدالقیوم انصاری کی صدارت میں منعقد سارن ڈویژنل اردو کانفرنس و آل بہار مشاعرہ میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ صرف زبان سے کہنے سے اردو کی بقا نہیں ہوجائے گی۔ کتنے لوگ ہیں جو اردو کو اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں۔ کتنے بچے ہائی اسکول اور کالجوں میں اردو پڑھتے ہیں۔ ہماری حکومت اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہے لیکن اردو کی ترقی میں آپ کی حصہ داری نہایت ضروری ہے۔ آج لوگوں نے گوپال گنج کی سرزمین پر اردو بھون، تعمیر کرانے کے لیے مطالبہ کیا لیکن آپ لوگوں کو بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم پرائمری سے لے کر ہائیر ایجوکیشن تک دلانے کے لیے کمربستہ رہیں گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک سال کے اندر گوپال گنج کی سرزمین پر اردو بھون بن کر تیار ہوجائے گا۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ اردو کی روٹی کھاتے ہیں وہی اردو سے کوسوں دور ہیں۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا سابق وزیر اعلیٰ بہار نے اپنے دور اقتدار میں اردو ٹرانسلیٹروں کی بحالی کی تھی۔ آپ کو بھی اردو میں درخواستیں دینی چاہیے تھیں لیکن آپ ایسا نہیں کرتے ہیں۔ اردو کے نام پر جو لوگ بحال ہوتے ہیں چونکہ ان کے پاس کوئی کام نہیں ہے تو سرکار انھیں دوسرے محکمے کا کام سونپ دیتی ہے اس لیے آپ خود اس جانب متوجہ ہوں اور ہر محکمے میں اردو میں درخواستیں دیں تاکہ اردو کی ترقی ممکن ہوسکے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایڈوائزری بورڈ اور اردو مشاورتی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئے گی۔ کئی جگہوں پر اس کی تشکیل ہوچکی ہے یہاں بھی بہت جلد ہوگی۔ اس موقع پر ضلع کلکٹر رمیش لال اور ڈی ایس او رگھوناتھ پرساد وغیرہ موجود تھے۔ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں انجمن کے ضلع صدر اظہار الحق صدیقی، نائب صدر سید مبین الحق اور جنرل سکریٹری معراج الدین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

[illegible] سے [illegible] حقوق [illegible] جانے پر زور

● مرادآباد، 23 جون۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام اور انصار انٹر کالج کے اشتراک سے اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے اور اردو کو اس کے جائز حقوق دیے جانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر وزیر مملکت حاجی اکبر حسین نے شرکت کی۔ صدارت ممبر اسمبلی عقیل الرحمٰن خاں اور نظامت سینئر صحافی سید محمد ہاشم نے کی۔ پروگرام میں خاص طور پر سابق وزیر حافظ محمد صدیق، میئر ڈاکٹر ایس ٹی حسن، سابق میئر ہمایوں قدیر، شہر امام، سید معصوم علی آزاد، سابق امام شہر شیعہ مسلک مولانا مظفر سلطان ترابی، بی ایس پی کے ضلع صدر ڈاکٹر سنجیو لال، بی ایس پی کے شہر صدر محمد کامل، بی جے پی اقلیتی سیل کے لیڈر ڈاکٹر محمد آصف کے علاوہ بابر خاں، ڈاکٹر شمشاد، پروفیسر اے شاکر، حاجی اکرام منصوری، عزیز الحسن وغیرہ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر سید محمد سیادت نقوی، ڈاکٹر صابر حسین، ڈاکٹر حسن احمد نظامی، ڈاکٹر رخسانہ بیگم، اسما عزیز، ڈاکٹر محمد الیاس، انصار انٹر کالج کے پرنسپل مہربان حسین اور پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر معراج الحسن سہوانی نے اردو زبان کے مختلف موضوعات کے حوالے سے اپنے مقالات پیش کیے۔ مقررین نے کہا کہ اردو ہماری سیکولر روایات کا حصہ ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو زبان آج بھی اپنے جائز حقوق سے محروم ہے جس کے لیے ارباب سیاست کے علاوہ اردو داں طبقہ ذمے دار ہے۔ مقررین نے اردو کو باضابطہ طور پر دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے اور آٹھویں جماعت تک تمام اسکولوں میں اردو کو لازمی قرار دیے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ وزیر مملکت حاجی اکبر حسین نے یقین دلایا کہ سرکار اردو کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دے گی۔ صدر جلسہ عقیل الرحمٰن نے اردو کے حوالے سے مسائل کو حکومت تک پہنچانے اور انھیں حل کرانے میں اپنی جانب سے پورے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ محکمہ ایجوکیشن کے جوائنٹ ڈائرکٹر اشوک کمار اپادھیائے نے پروگرام کا آغاز کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں سے غیر اردو داں ٹیچروں کے تبادلے کا مطالبہ

● الہ آباد، 28 رجون۔ حق اطلاع قانون کے تحت مانگی گئی اطلاع میں ضلع بنیادی تعلیمی افسر (بی ایس اے) سلطانپور نے تحریری طور پر تسلیم کیا کہ ضلع سلطانپور کے 9 اردو میڈیم اسکولوں کی 35 منظور شدہ اردو ٹیچر کی پوسٹ میں سے 16 عدد خالی ہیں اور ان اسکولوں میں دو دو شکشا متر مقرر ہیں جن کی تعلیمی لیاقت میں اردو کا علم لازمی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان اسکولوں میں درس و تدریس کا کام انجام دے رہے 19 ٹیچروں میں سے 8 غیر اردو داں تعینات ہیں۔ یہ اطلاع اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کو دیتے ہوئے بی ایس اے سلطانپور امرکانت سنگھ نے اپنے خط میں کہا ہے کہ ضلع میں سینئر بیسک اسکول کی تعداد ایک بھی نہیں ہے اور دفتر میں اردو اخبارات کو

اشتہارات دینے کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اردو میں سائن بورڈ دفتر میں لگا ہوا ہے اور سرکاری احکام پر عمل کیا جاتا ہے۔ مفت کتاب مہیا کرائے جانے والی لسٹ اور پانچ سال کا سرکلر منسلک ہے جو 78 صفحات پر مشتمل ہے۔ مذکورہ خط کی فوٹو کاپی اردو میڈیا کو مہیا کراتے ہوئے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے اپنے جاری بیان میں کہا کہ بی. ایس. اے. کے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی جائے گی کیونکہ اس میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مدعی کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دفتر کا بورڈ اردو میں نہیں لکھا گیا ہے بلکہ افسر کی نیم پلیٹ اردو میں لکھی ہے۔ سرکلر میں 2005 سے اردو میڈیم کی کتابیں مفت فراہم کرانے کی بات کہی گئی ہے مگر کہیں بھی مہیا نہیں کرائی گئیں۔ کتابوں کی لسٹ میں درجہ 8 تک کی اردو میڈیم کتابوں کا ذکر ہے مگر سلطانپور میں ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں۔ اسکولوں سے غیر اردو داں ٹیچروں کا فوراً تبادلہ کیا جائے اور اردو میڈیم کے سینئر بیسک اسکول کھولے جائیں۔ بی. ایس. اے. سلطانپور نے اردو درخواست کا جواب اردو میں دے کر قابل تحسین کام کیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ایوان میں اردو کا سوال اٹھانے کی اپیل

● الہ آباد، 29 جون۔ ادبی و لسانی تنظیم اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے ریاست کے اردو داں ممبران اسمبلی سے اپیل کی ہے کہ وہ اسمبلی میں قانون اردو کے نفاذ کا سوال اٹھائیں۔ اس کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ مایاوتی سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آئین ہند کی دفع 210۔ اور یوپی آفیشیل لینگویج (امنڈمنٹ) ایکٹ-1989 (قانون اردو)۔ کے مطابق ایوان کے طریقۂ کار اور ضابطوں کی اشاعت سرکاری زبان اردو میں بھی کرائیں۔

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے اپنے بیان میں کہا کہ اردو داں ایم ایل اے حضرات کو اسمبلی میں قانون اردو کا یہ سوال اٹھانے چاہئیں کہ (1) جب ریاست میں سرکاری زبان ہندی کی تعلیم لازمی ہے تو سرکاری زبان اردو کی تعلیم لازمی کیوں نہیں کی جارہی ہے؟ (2) سرکاری ملازمت کے لیے تعلیمی لیاقت میں ہندی کی طرح اردو کا علم لازمی کیوں نہیں ہے؟ (3) قانون اردو کے مطابق کوئی بھی قانون کی کتاب اردو داں عوام کے مفاد میں اردو میں کیوں نہیں شائع کی جارہی ہے؟ (4) قانون اردو کے مطابق ہر محکمے کا درخواست فارم اردو میں شائع کرا کر اردو داں عوام کو کیوں نہیں دیا جارہا ہے؟ (5) اترپردیش میں کتنے لوگوں کی مادری زبان انگریزی ہے جس کی بنیاد پر اشتہار بجٹ کا 20 فیصد انگریزی اخباروں کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور ہندی و اردو سرکاری زبان کے اخباروں کا اشتہاری بجٹ مساوی کیوں نہیں ہے؟ یعنی اردو کے لیے صرف 10 فیصد اور ہندی کے لیے 70 فیصد کیوں مقرر کیا گیا ہے۔

اختر چوڑی والا نے کہا کہ 2003 میں جب سپریم کورٹ نے اسمبلی اسپیکر کو نوٹس جاری کی تھی تو میں نے ادارالشفا میں اعظم خاں سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے اردو کا کوئی بھی سوال اسمبلی میں اٹھانے سے انکار کردیا تھا اور برجستہ کہا تھا کہ" میں مسلمانوں کے ووٹ سے جیت کر اسمبلی میں نہیں پہنچا۔ آج کا سفید پوش مسلمان صرف لفاظی کرتا ہے۔" میں نے ان سے کہا کہ ہم لوگ اردو کے آئینی حقوق کی بازیابی کے لیے آئے ہیں اور سپریم کورٹ نے اسمبلی کی کارروائی اردو میں بھی چلائے جانے کے لیے حکومت کو نوٹس جاری کی ہے، برائے مہربانی اسے دیکھ لیجیے۔ تو انھوں نے نوٹس لینے سے انکار کردیا تھا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

دینی مدارس نے اردو زبان کو زندہ رکھا

● سنت کبیر نگر، 13 جون۔ مدارس اسلامیہ ہمارے قلوب و اذہان کو بالیدگی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اخوت و مساوات صلح و آشتی اور جذبۂ حب الوطنی سے اپنے طلبہ کو سرشار کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار دارالعلوم احمدیہ معراج العلوم دھرم سنگھوا بازار کے پرنسپل مولانا علی احمد بسمل عزیزی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ دینی مدارس نے جہاں حضرت نظام الدین اولیا، حضرت عبدالحق محدث دہلوی، حضرت مولانا امجد علی اعظمی، مولانا عبدالعزیز محدث مرادآبادی وغیرہ جیسی عظیم روحانی شخصیتیں پیدا کی ہیں، وہیں علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت علی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا لیاقت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد، جیسے مجاہدین آزادی اور سیاسی قائدین کو بھی پیدا کیا۔ انھوں نے کہا کہ دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی نمایاں خدمات میں بھی مدرسوں کا اہم کردار رہا ہے۔ اور بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے کا جو کچھ بھی رسم و رواج آج موجود ہے وہ صرف دینی اداروں کی دین ہے۔ مولانا نے کہا کہ "سب کو تعلیم" کی مہم پر حکومتیں جو سرمایہ پانی کی طرح بہا رہی ہیں اگر اس کا نصف بھی دینی مدارس پر صرف کردیا جائے تو سب کو تعلیم کا خواب بہت جلد شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا۔ یہ دینی مدارس مذہبی، معاشرتی اور سماجی علوم کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ہندی، حساب، سائنس اور انگریزی جیسے بہت سارے مضامین پڑھاتے ہیں اور بلاتفریق مذہب و ملت ہر ایک کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں جب کہ بیشتر دینی ادارے سرکاری امداد سے بے نیاز ہوکر محض عوامی تعاون و عطیات پر اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔

انھوں نے کہا کہ غریب مسلم قوم قابل مبارکباد ہے جس نے نامساعد حالات کے باوجود دینی مدارس کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کے لازمی نفاذ کا جی او جاری کیا جائے

● فیض آباد، 13 رجون۔ اردو بچاؤ تحریک کی مجلس عاملہ کی میٹنگ حافظ ندیم کی صدارت میں ہوئی۔ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے تحریک کے کنوینر ڈاکٹر محمد حلیم نے کہا کہ اردو زبان کی حالت سدھارنے کے لیے اسکولوں میں اردو لازمی طور سے پڑھنے کے لیے نئی حکومت کو فی الحال جی او جاری کرنا چاہیے۔ انھوں نے صوبے میں محترمہ مایاوتی کی نئی حکومت کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حکومت میں تمام محروم طبقوں کے لوگوں کو زندگی کی تمام سہولیات فراہم کرانے کے لیے غور وفکر کیا جارہا ہے۔ ایک تجویز پاس کرکے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اردو کو درجہ 8 تک سہ لسانی فارمولہ کے تحت لازمی کرنے کے لیے جی او جاری کیا جائے۔ ساتھ ہی اردو اکادمی کے بجٹ میں دس گنا اضافہ کیا جائے۔ اردو اکادمی کی صدارت کی کرسی کسی نااہل کو نہ دی جائے۔ اس سے اردو کا اب تک کوئی بھلا نہیں ہوا ہے۔ اس موقع پر ارشاد احمد راعینی، حافظ محمد ندیم، احکام الٰہی، ماسٹر نعمت اللہ، مولانا رضوان خاں، نبی اللہ قریشی، رونق علی سلیمانی، عزیز واصف، اور ثاقب حسین رضوی موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کی بقا کے لیے اردو میڈیم ضروری

● نئی دہلی، 16 رجون۔ یونائٹیڈ مسلم آف انڈیا (دہلی یونٹ) کی جنرل میٹنگ میں کہا گیا کہ گذشتہ کئی برسوں سے اردو میڈیم اسکولوں کی نہ تو نصابی کتابیں وقت پر دستیاب ہورہی ہیں اور نہ ہی خالی اسامیوں کو پُر کیا گیا ہے۔ گذشتہ برس نیشنل کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی انسٹی ٹیوشنز کی جانب سے حکومت دہلی کو نوٹس دیے جانے کے باوجود اردو میڈیم اسکولوں کو بنیادی سہولیات مہیا نہیں کی گئیں۔

میٹنگ میں مہمان خصوصی ڈاکٹر لال بہادر نے ان لوگوں کے مشوروں کو احمقانہ قرار دیا جو یہ کہتے ہیں کہ بطور زبان اردو کو فروغ دیا جائے مگر اردو میڈیم اسکولوں پر زور نہ دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی دیگر علاقائی زبانوں مثلاً گجراتی، مراٹھی اور بنگلہ وغیرہ کے میڈیم والے اسکول اگر کامیابی سے چل سکتے ہیں تو پھر اردو میڈیم اسکولوں کو کیوں نہیں چلایا جاسکتا ہے۔

میٹنگ کی صدارت سنہری مسجد چاندنی چوک کے امام وخطیب مولانا فرقان احمد قاسمی نے کی اور اس موقع پر اتفاق رائے سے یہ قرارداد منظور کی گئی:

''اردو میڈیم اسکولوں کو بند کرنے والوں کے مشوروں کی سخت مذمت کی جاتی ہے اور مرکزی اور صوبائی حکومت سے پرزور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اردو اس ملک کی قومی زبان ہے اور کثیر آبادی کے جذبات اس زبان سے وابستہ ہیں لہٰذا اردو کی ترویج وترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے اور اردو میڈیم اسکولوں کی بہتری کے اقدام کیے جائیں نیز اساتذہ اور نصابی کتابوں کی دستیابی کو یقینی بنایا جائے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں، ڈاکٹر ایم اے حفیظ کاردار، مبعوث احمد، سالک دھام پوری وغیرہ نے خاص طور سے اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

ایک مدرسہ جہاں 40 فیصد طلبہ ہندو ہیں

● بیربھوم، 26 جون۔ گذشتہ دنوں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ یہاں کے ایک مدرسے میں ایک ہندو لڑکی ہیم لتا قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے، آج کے لوگوں کے لیے یہ خبر متحیر کن ہوسکتی ہے لیکن آزادی کے پہلے اور اس کے بعد چند عشرے تک غیر مسلم افراد اردو، عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اور مسلمان ہندی اور سنسکرت پڑھا کرتے تھے لیکن حالات ایسے بدلے کہ زبان کو بھی مذہب سے منسلک کردیا گیا اور آج بہت ہی کم ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو زبان کو ایک علمی وسیلۂ اظہار کے طور پر دیکھتے ہیں۔ آج کے دور میں کسی مدرسے میں غیر مسلم بچوں کا تعلیم حاصل کرنا حیرت انگیز بات ہوسکتی ہے لیکن بیربھوم ضلع کے رام پور ہاٹ میں ایک ایسا مدرسہ ہے جہاں 40 فیصد ہندو طلبہ وطالبات تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سال کے مدھیامک امتحان میں پہلا مقام حاصل کرکے اس مدرسے کی ایک طالبہ نے مدرسے کا نام روشن کیا۔ مذکورہ مدرسے کی رپورٹ کے مطابق یہاں کل 379 غیر مسلم طلبہ وطالبات تعلیم حاصل کرتے ہیں جس میں ایس سی 99 اور ایس ٹی کے 3 طلبہ ہیں۔ یہاں ٹیچروں کی تعداد 7 ہے۔ اس سال مدھیامک امتحان میں اس مدرسے کی طالبہ راکھی منڈل اپنے اسکول میں سرفہرست ہے۔ وہ رام پورہاٹ کے گل دھیانی پاڑہ کی رہنے والی ہے۔ فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہونے والوں میں بھی غیر مسلم طلبہ کی تعداد زیادہ رہی۔ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا کہنا ہے کہ اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو ہماری پڑھائی ختم ہوجاتی۔ اسکولوں میں پڑھنے کا خرچ زیادہ ہے جب کہ مدرسے میں ہمیں مفت کتابیں دستیاب ہوجاتی ہیں۔ اس مدرسے کا نام حاجی مولانا داشت ہائی مدرسہ ہے۔ اس کے ہیڈ ماسٹر غلام کبریا کا کہنا ہے کہ اس مدرسے میں ہندو اور مسلم طلبہ وطالبات ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

دوستی کا پل

● لاہور (پاکستان) کے الحمرا آرٹ سینٹر میں گذشتہ دنوں بھارت کے مشہور ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کے ادبی سفر کے پچاس برس مکمل ہونے پر پاکستان رائیٹرز فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک تقریب منعقد کی گئی۔ فاؤنڈیشن کی دعوت پر ڈاکٹر دھیر بطور خاص لاہور پہنچے تھے۔ اس موقع پر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کی طرف سے شائع کی گئی کتاب ''ڈاکٹر کیول دھیر: ادبی سفر کے پچاس برس'' اور انگریزی کتاب ''گولڈن ہارویسٹ'' کی رسم رونمائی بھی ادا کی گئی۔ تقریب کی صدارت اردو کی مشہور ناول نگار اور پاکستان پارلیمنٹ کی رکن بیگم بشریٰ رحمٰن نے کی جب کہ مہمان خصوصی پاکستان کے فیڈرل منسٹر برائے پارلیمانی امور جناب کامل علی آغا اور سینئر صحافی جناب حمید اختر تھے۔ اس تقریب میں جن لوگوں نے اظہار خیال کیا ان میں سلیم اختر، امجد اسلام امجد، عطاالحق قاسمی، اصغر ندیم سید، عارف منصور، حمید اختر، ریاض ہانس، اظہر جاوید، پروفیسر آصف ہمایوں اور ڈاکٹر سلیم ملک کے نام شامل ہیں۔ اس ادبی تقریب میں بہت بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، فنکاروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔

مہمان خصوصی جناب کامل علی آغا نے کہا کہ ڈاکٹر کیول دھیر پاکستان اور بھارت کے امن پسند عوام کے درمیان دوستی کی مضبوط کڑی ہیں۔ بیگم بشریٰ رحمٰن نے کہا کہ کیول دھیر اردو کے ایک بڑے فنکار ہی نہیں وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے دم سے دنیا کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جناب عطاالحق قاسمی نے کہا کہ کیول دھیر تمام عالم میں امن کے قیام کے خواہاں ہیں اور اگر پاکستان اور بھارت میں ان جیسے فنکار وزیراعظم ہو جائیں تو دونوں ملکوں کے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ جناب حمید اختر نے کہا کہ کیول دھیر کے پچاس سالہ ادبی سفر پر جو کتاب آج یہاں ریلیز ہوئی ہے اس میں پاکستان اور بھارت کے دوسو سے زائد صفِ اوّل کے نقادوں اور ادیبوں نے ان کی ادبی خدمات کو دل کھول کر سراہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں وہ یکساں طور پر مقبول ہیں۔ جناب امجد اسلام امجد نے کہا کہ کیول دھیر پچاس برسوں کے ادبی سفر میں اپنے کئی ہمعصر فنکاروں سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ریاض ہانس، اصغر ندیم سید، عارف منصور، سلیم اختر اور ڈاکٹر سلیم ملک نے بھی ڈاکٹر کیول دھیر کے فن اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس موقع پر بھارت کے سابق وزیراعظم جناب اندر کمار گجرال کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ اردو ادب کے فروغ کے لیے ڈاکٹر کیول دھیر کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ انھوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان باہمی رشتوں کو استوار کرنے کے لیے ایک پل کی طرح کام کیا ہے۔ (ڈاک سے)

''میر کارواں'' کی رسم اجرا اندر کمار گجرال نے انجام دی

● نئی دہلی، 14 جولائی۔ حیدرآباد، مولانا آزاد نے علم کو میدان عمل تک پہنچانے میں جس طرح کا کلیدی رول ادا کیا تھا آج مولانا آزاد سے موسوم اردو کی جامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اسی مشن کو آگے بڑھا رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار سابق وزیراعظم جناب آئی کے گجرال نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سی آئی ٹی آڈیٹوریم میں پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری، بانی وائس چانسلر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر محیط کتاب ''میر کارواں'' کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کیا۔ موجودہ وائس چانسلر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی پروفیسر اے. ایم. پٹھان نے اس تقریب کی صدارت کی۔

جناب گجرال نے کہا کہ ہماری کوشش تھی کہ اردو سے تعلق رکھنے والے صرف شاعر ہی نہیں سائنسداں بھی بنیں اور آج اردو یونیورسٹی اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ جناب گجرال نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کے قیام میں پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے انتہائی اہم کردار نبھایا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

مہمان اعزازی ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے پروفیسر شمیم جیراجپوری کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شمیم نے جس وسیع النظری اور دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اردو یونیورسٹی کے کارگزاروں کا خاکہ بنایا تھا اسی کے باعث یونیورسٹی ترقی کی سمت گامزن ہے۔ پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کی شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں کے تعارف پر مبنی اس کتاب کو ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (علی گڑھ) اور ڈاکٹر شجاعت علی راشد (حیدرآباد) نے مرتب کیا ہے۔

کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ کتاب میں تاریخ کے ایک اہم دور کو محفوظ کر لیا گیا ہے کیونکہ اس میں ایک شخصیت کے ساتھ ساتھ ایک عہد کو بھی سمیٹا گیا ہے۔ اردو والے صرف مایوسی کی بات کرتے ہیں لیکن جب ہم گجرال صاحب، شمیم صاحب اور پٹھان صاحب جیسے لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی جو خود اعتمادی کھودی ہے وہ واپس آ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی نے اپنے قیام کے ساتھ ہی کامیابی کی نت نئی منزلوں کو طے کرنا شروع کر دیا تھا اور موجودہ وائس چانسلر پروفیسر اے. ایم. پٹھان کی قیادت میں آج بھی نت نئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے پروفیسر شمیم جیراجپوری کی خدمات کو خراج تحسین

پیش کرتے ہوئے کہا کہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہونے کے باوجود کچھ باتوں کے حوالے سے وہ میرے لیے محترم ہیں۔ پروفیسر حنفی نے کہا کہ ان کو ورثے میں جو ملا تھا اس کی حفاظت تو انھوں نے کی لیکن اردو یونیورسٹی کو کاغذی پیرہن سے عملی شکل دیتے ہوئے پروفیسر شمیم نے جو ورثہ چھوڑا ہے اس کی حفاظت ساری دنیا کے محبان اردو کو کرنی چاہیے۔

پروفیسر اے. ایم. پٹھان، وائس چانسلر اردو یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق لوگوں میں غلط فہمیاں اور احساس کمتری پایا جاتا تھا لیکن پروفیسر جیراجپوری نے اپنی دور اندیشی اور فراست کے ذریعے اردو یونیورسٹی کو خواب سے حقیقت تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ پروفیسر پٹھان نے پروفیسر جیراجپوری کی خدمات کو ناقابل فراموش قرار دیتے ہوئے اردو یونیورسٹی کے لیے ان کی خدمات کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

''دستنبو'' کے اردو ترجمے کا ڈاکٹر اے آر قدوائی کے ہاتھوں اجرا

● نئی دہلی، 13 جولائی۔ ''ایسا لگتا ہے کہ مخمور سعیدی نے غالب کی روح کو پہلے اپنے اندر اتارا ہے پھر اس کے بعد ان کی کتاب ''دستنبو'' کا ترجمہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر غالب ''دستنبو'' اردو میں لکھتے تو اس سے بہتر نہیں لکھ سکتے تھے۔'' ان خیالات کا اظہار آج انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے زیر اہتمام معروف شاعر مخمور سعیدی کی نئی کتاب ''1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی'' کی رسم رونمائی کے موقع پر معروف دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ یہ کتاب غالب کی فارسی تصنیف ''دستنبو'' کے اردو ترجمے اور ان کے ان خطوط پر مشتمل ہے جن میں 1857 کے واقعات کا ذکر آتا ہے۔ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے شائع کی ہے۔ کتاب کا اجرا ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس موقع پر ان تمام نظموں اور مضامین کو بھی جمع کرکے شائع کیا جانا چاہیے جن پر انگریزوں نے پابندی عاید کردی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی 500 سالہ تاریخ کا سرمایہ فارسی اور اردو میں محفوظ ہے جسے نئی نسل تک پہنچانے کے لیے دیوناگری میں شائع کیا جانا چاہیے۔

تقریب کی نظامت پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ انھوں نے ''دستنبو'' کے حوالے سے غالب پر نکتہ چینی کرنے والوں کو نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ صرف غالب پر یہ الزام لگانا کہ وہ انگریز نواز تھے سراسر غلط ہے۔ اس دور کے دوسرے دانشوروں اور ادیبوں نے بھی انگریزوں کا گن گان کیا ہے کیونکہ وہ اس دور میں ان کی مجبوری تھی۔

زبیر رضوی نے کہا کہ غالب پر یہ الزام درست نہیں ہے کہ انھوں نے 1857 کے انقلاب کی سنی سنائی باتیں لکھی ہیں۔ انھوں نے جہاں تک ممکن ہوا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ''دستنبو'' غالب کے ایک ذہنی رویے کی عکاسی کرتی ہے لیکن خطوط میں ایک دوسرا ہی غالب نظر آتا ہے۔ مخمور سعیدی نے اچھا کیا کہ کتاب میں ان کے خطوط بھی شامل کرلیے۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام نے کہا کہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو پھر سے کھنگالنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ ''دستنبو'' کی اردو میں اشاعت دراصل اپنی تاریخ کو نئے سرے سے سمجھنے کی ایک مثبت کوشش ہے۔ اس کتاب کی ایک دستاویزی حیثیت ہے۔ کتاب کے مترجم اور معروف شاعر و ادیب مخمور سعیدی نے کہا کہ غالب پر انگریز نوازی کا الزام لگانا درست نہیں ہے۔ ان کی بنیادی پہچان ان کی انسان دوستی ہے۔ اگر وہ ایک طرف باغیوں کے ہاتھوں انگریز حاکموں اور ان کے افراد خاندان کی ہلاکتوں پر باغیوں کو برا بھلا کہتے ہیں تو دوسری طرف انگریز فوجیوں نے ہندستانیوں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا اس کی بھی انھوں نے پردہ پوشی نہیں کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب نے سچائیوں پر پردہ نہیں ڈالا ہے بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں ہی سہی انھیں بیان کردیا ہے۔ اس سے قبل ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری اور معروف ادیب کشمیری لال ذاکر نے ''دستنبو'' کے حوالے سے غالب کے رویے پر کئی سوال اٹھائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب نے ناانصافی اور ظلم و ستم کی داستان کو رنگ و بو کا گلدستہ کیوں قرار دیا اور اس کا نام ''دستنبو'' کیوں رکھا؟ انھوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ غالب نے لفظ ''انقلاب'' کا استعمال کرنے کے بجائے ''بغاوت'' کیوں لکھا؟ کتاب کے آخر میں انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی خوب مدح سرائی کی ہے۔ جو شخص انگریزوں کی اس طرح تعریفیں کرنے والا ہو اس سے حقیقت بیان کرنے کی امید کیسے کی جاسکتی ہے؟ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے چیئرمین اور مشہور مورخ بپن چندر نے اپنی مختصر تقریر میں بتایا کہ بک ٹرسٹ 1857 کی پہلی جنگ آزادی سے متعلق اور بھی کتابیں شائع کرے گا۔ ان میں کئی کتابیں اردو کی بھی ہوں گی۔ ٹرسٹ کی ڈائرکٹر محترمہ نزہت حسن نے تمام مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اردو دوست بک ٹرسٹ انڈیا کی اس کوشش کو ضرور سراہیں گے۔ اس تقریب میں متعدد ادبی و سماجی شخصیات نے شرکت کی جن میں سید شاہد مہدی، بیگم شاہد مہدی، نرل سنگھ نرل، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، مرغوب عابدی، انیس اعظمی، راغب الدین، محمد شمیم، ڈاکٹر ابوبکر عبّاد، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر حسن مہدی، انجم عثمانی، انیس درانی، مجتبیٰ حسین،

متین امروہوی، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر سمیع الرحمٰن، نور جہاں ثروت، سریندر سنگھ، شجر معصوم مرادآبادی، اشتیاق احمد عارفی، نارنگ ساقی، ڈاکٹر احمد محفوظ، معین شاداب، بیگم وسیم راشد ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی اور دیگر کئی اہم شخصیات شامل تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختار الدین کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

● علی گڑھ، 4 جولائی۔ عربی زبان و ادب کے ممتاز اسکالر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر مختار الدین آرزو کو علی گڑھ ایلومنائی ایسوسی ایشن، نیویارک (امریکہ) کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں امسال لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ امریکہ میں مقیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبائے قدیم کی تنظیم کی جانب سے ہر سال ادب، شاعری، آرٹ اور سائنس کے میدان میں عالمی شہرت یافتہ دانشوروں کو اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ پروفیسر مختار الدین آرزو کو یہ ایوارڈ 3 نومبر 2007 کو نیویارک میں منعقد ہونے والی یوم سرسید تقریبات میں پیش کیا جائے گا۔

یہ ایسوسی ایشن ہر سال اپنا یادگاری مجلہ بھی شائع کرتی ہے۔ اس سے قبل یہ اعزاز ڈاکٹر معین احسن جذبی، شان الحق حقی، انتظار حسین، ممتاز سائنسداں پروفیسر عبید صدیقی اور فلمی دنیا کی مشہور شخصیت شیام بینیگل کو دیا جا چکا ہے۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

گلزار دہلوی کو میکش ایوارڈ

● آگرہ کی ادبی انجمن ''بزم میکش'' کے زیر اہتمام گذشتہ 22 اپریل 2007 کو ایک پروقار تقریب میں پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کو میکش ایوارڈ سال 2006 سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ بزم کے سرپرست سید اجمل علی شاہ اور بزم کے صدر حکیم سید مرغوب الرحماں نے پیش کیا۔ ایوارڈ میں ایک میڈل، بزم میکش کا مومنٹو، شال، نقد رقم اور سپاس نامہ شامل تھا۔

طالب رام پوری، ایم سلیم، اور رؤف رامش مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ طالب رام پوری سب ایڈیٹر ''مہکتا آنچل'' ایم سلیم ایڈیٹر ''پیغام چمن'' اور ''اخبار نو'' کے ایڈیٹر انچارج رؤف رامش کو بھی اعزازی ٹرافیاں دی گئیں۔ پروگرام کا آغاز بزم کے سکریٹری ڈاکٹر ارشاد احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ بزم کی جنرل سکریٹری ڈاکٹر نسرین بیگم نے گلزار دہلوی اور مہمانان خصوصی کا تعارف کرایا اور بزم میکش کی کارگزاریوں کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد علامہ میکش اکبرآبادی کے فن اور شخصیت پر سیمینار منعقد ہوا۔ جس میں ڈاکٹر شفیق اشرفی، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر راشد انور راشد نے مقالات پیش کیے۔ گلزار دہلوی نے اس موقعے پر کہا کہ آگرہ تاریخی طور پر ہی قدیم نہیں، یہاں کی ادبی و ثقافتی تہذیب بھی قدیم ترین اور عالمی سطح پر روشن ہے۔ اس شہر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں علم و ادب اور تصوف کی نمائندہ علامہ میکش اکبرآبادی جیسی شخصیات بہ کثرت پیدا ہوئیں۔

اس کے بعد اردو مضمون کے ساتھ ہائی اسکول، انٹر اور بی اے میں اول، دوئم اور سوئم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو بزم میکش کی طرف سے سند اور میڈل دیے گئے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● پنچکولہ، 22 جون۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے اردو کے معروف ادیب اور شاعر اور مجاہد آزادی جناب بال کرشن مضطر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں جناب پھول چند ملانا، وزیر تعلیم ہریانہ نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ بال کرشن مضطر 17 اپریل 2007 کو ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے، ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ آپ ایک بڑے قلم کار ہی نہیں ایک بہادر انسان بھی تھے۔ اردو ادب میں آپ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آپ کا تعلق ہریانہ سے تھا اس لیے ہریانہ اردو اکادمی ان کے نام سے ایک ایوارڈ بھی جاری کرے گی جو ہریانہ کے قلم کاروں کے لیے مختص ہوگا۔ اس ایوارڈ کی تجویز ڈاکٹر کمار پانی پتی نے پیش کی۔

اس سے قبل ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے وزیر تعلیم ہریانہ، بال کرشن مضطر کے فرزند جناب نجے، پاکستان سے آئے ہوئے جناب اعجاز اللہ ناز، آغا مزمل علی، جناب ولسن برکت، جناب محمد شہزاد اور دیگر سبھی مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور کہا کہ جناب بال کشن مضطر ستاون (57) کتابوں کے خالق تھے۔ وہ ایک بڑے ادیب اور شاعر اور مجاہد آزادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی بھی تھے وہ ہریانہ اردو اکادمی کے پروگراموں میں خصوصی دل چسپی لیتے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔

اس موقع پر جناب بال کرشن مضطر کی شخصیت اور ان کے فن پر ڈاکٹر کمار پانی پتی، ڈاکٹر رانا گنوری اور جناب کے. کے. رشی نے مقالے پیش کیے۔ پنجابی ساہتیہ اکادمی کے ڈائرکٹر جناب مودگل نے بھی آنجہانی بال کرشن مضطر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے ادا کیے۔ اس موقع پر جناب بال کرشن مضطر کی کتابوں پر مشتمل نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 2رجون۔ اردو پریس کلب اور ویمن کلیان چیریٹیبل سوسائٹی کی جانب سے آج شام پریس کلب میں ''شام غزل'' کا انعقاد کیا گیا جس میں ممبئی کے معروف گلوکار وجاہت حسین خاں اور دہلی کی محترمہ شنگامترا نے اپنی مترنم آواز سے سامعین کو مسحور کر دیا۔ شنگامترا نے ''ٹھمری'' اور ''دادرا'' پیش کر کے کلاسیکی گلوکاری کے فن پر اپنی دسترس کا مظاہرہ کیا وہیں وجاہت حسین خان نے معروف شعرا کی غزلیں پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ اردو پریس کلب کی اسٹیئرنگ کمیٹی کے رکن اور معروف ادیب پیغام آفاقی نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو پریس کلب کی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے جاری سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں سب کو جوڑنے کی طاقت ہے۔ اس نے یہ کام ماضی میں بھی کیا ہے اور مستقبل میں بھی کرتی رہے گی۔ اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری طارق فیضی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ اردو پریس کلب اردو کی ترویج و ترقی کے لیے سرگرم ہے اور اس کی سرگرمیوں میں اور اضافہ کیا جائے گا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض وسیم راشد نے انجام دیے۔

ساز و آواز کی اس محفل میں مہمانان خصوصی کے طور پر مرکزی وزیر برائے سائنس وٹیکنالوجی کپل سبل، معروف صحافی اور ممبر پارلیمنٹ کلدیپ نیر، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے ایڈیٹر عزیز برنی اور جی سائرسوری نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● پونے۔ ایم.سی.ای. سوسائٹی، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، گولڈن جوبلی ایجوکیشن ٹرسٹ، بزم خواتین اور تعلیمہ ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے کی جانب سے پروفیشنل کورسز کے 423 طلبہ و طالبات کو اسکالرشپ کی تقسیم کے لیے اعظم کیمپس کے ثقافتی ہال میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ متور پیر بھائی چیئرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ نے اسکالرشپ اسکیم کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے اس طریقۂ کار کی وضاحت کی جس کے تحت امسال چالیس لاکھ روپے بہ طور اسکالرشپ ایم بی بی ایس 43، بی ایچ ایم ایس 17، بی اے ایم ایس 13، بی فارم 26، انجینئرنگ 147، ایم فارم 2، ایم ایڈ 1، ایم بی اے، ایم سی ایم، ایم سی اے، ایم سی ایس، سی اے، ایم ایس سی، بی ایڈ 57 اور ڈپلوما، ڈی ایڈ کے 117 طلبہ و طالبات کو اپنی تعلیمی ضروریات کے لیے دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی شخصیت سازی کے کیمپ کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں شہر کے نامور ٹرینر لقمان قاضی نے مقصدِ حیات کے عنوان کے تحت طلبہ کو پیشہ ورانہ زندگی نیز ذاتی زندگی میں پیش آنے والی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے، اپنے ہدف کو پانے، دینی فرائض کی ادائیگی، سماجی خدمات، صحت اور تندرستی جیسی تمام ضرورتوں کو ٹائم مینجمنٹ کے ذریعے بخوبی ادا کرنے کے راز بتائے۔

اسکالرشپ تقسیم کے پروگرام کے مہمان خصوصی اور دوست محمد پیر محمد اوارے کے رکن جناب مرتضیٰ اچھوانے کہا کہ ہم اپنی اصلاح پر توجہ دیں اور دوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی نہ کریں۔ تعلیم کے جو وسائل آج مہیا ہیں ان کا بھرپور فائدہ اٹھا کر قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائیں۔ اچھے انسان بنیں اور انسانیت کی سربلندی کے لیے اپنے آپ کو تج دیں۔

جناب پی اے انعامدار صدر، ایم سی ای سوسائٹی، پونے نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہر قوم میں ذہین بچوں کا فیصد تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دیگر قومیں ان ذہین بچوں کو صحیح طور پر استعمال کرتی ہیں اور ہم ان کی ذہانت کو برباد کرتے ہیں۔ آپ نے پُر زور اپیل کی کہ تعلیم و ترقی کے پیش نظر آج ضرورت ہے کہ ہم گاؤں سے شہر کی طرف کوچ کریں کیونکہ ہجرت میں برکت ہے۔ شہروں میں گاؤں کی بہ نسبت آگے بڑھنے کے زیادہ امکانات ہیں ممتاز پیر بھائی کے شکریہ پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

● ممبئی۔ اردو کے ہر دور میں شعرا کی کثرت رہی ہے اور آج بھی ہے مگر ان میں چند ہی شعرا کو قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ جاوید ندیم کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ جاوید ندیم کی شاعری اردو شعر و ادب کا سرمایہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ندا فاضلی نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی اور تکمیل رائٹرس گروپ ممبئی کے اشتراک سے منعقدہ تقریب میں جاوید ندیم کی تازہ ترین شعری کتاب ''خیال موسم'' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔

صدارتی تقریر میں اردو ماہ نامہ ''پیش رفت'' دہلی کے مدیر ڈاکٹر سید عبدالباری نے کہا کہ جاوید ندیم ایک اعتدال پسند اور تعمیری ذہن وفکر کے حامل فنکار ہیں۔ واقعات و حادثات سے وہ سرسری گزرنے کے قائل نہیں بلکہ ان کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے جاوید ندیم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ جب کہ پروفیسر یونس اگاسکر نے کہا کہ جاوید ندیم کی شاعری اپنے عہد کی نمائندہ شاعری ہے۔ پروفیسر شفیع شیخ نے نہایت پرلطف اور دلچسپ انداز میں ''خیال موسم'' کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی محترمہ ممتاز منور پیر بھائی نے بھی جاوید ندیم کی شاعری کی خصوصیات کی طرف اشارے کیے۔

ڈاکٹر غلام حسین (اجین)، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری (بڑودہ) ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریا آبادی (حیدرآباد)، پروفیسر الیاس شوقی اور پروفیسر عالم ندوی (ممبئی) نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ ابتدا میں ڈاکٹر صاحب علی صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور شعبۂ اردو کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تعارف پیش کیا، اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ شعبے

کے قیام کو پچیس سال پورے ہونے جارہے ہیں لہٰذا رواں تعلیمی سال میں ہفتے بھر کی تقریبات کا انعقاد کرکے شعبے کی سلور جبلی منائی جائے گی۔

انھوں نے کہا کہ جاوید ندیم فرسودہ مضامین سے بچتے ہوئے اپنے جذبات کا عمدہ پیرائے میں اظہار کرتے ہیں۔ اس خوشگوموا قع پر شہر ممبئی کی متعدد انجمنوں، تنظیموں اور اداروں نے ''موسم خیال'' کے خالق جاوید ندیم کی خدمت میں گلہائے عقیدت اور شال پیش کیے اور جاوید ندیم نے اپنے چاہنے والوں کے تئیں ممنونیت کا اظہار کیا۔ آخر میں ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا جس کی صدارت رسالہ ''اسباق'' پونا کے مدیر نذیر فتح پوری نے کی۔ ممبئی اور بھیونڈی کے شعرائے کرام نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ تقریب میں شہر ممبئی کی علمی و ادبی شخصیتیں کافی تعداد میں موجود تھیں۔ شکریے کی رسم تکمیل رائٹرس گروپ ممبئی کے سکریٹری مظہر سلیم نے ادا کی۔
(ڈاک سے)

● جموں۔ جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے سینئر وکلا نے مشہور ادیب شری آنند لہر کے اعزاز میں ہائی کورٹ بار روم میں ایک تقریب منعقد کی۔ تقریب کی صدارت شری پی ایس دتہ سابق صدر بار ایسوسی ایشن نے کی اور افتتاحی تقریر شری شبیر احمد سلاریہ سابق ممبر پارلیمنٹ و سابقہ ایڈوکیٹ جنرل نے کی۔ شری سلاریہ نے کہا کہ لہر کی تحریروں میں انسانیت کا درد نمایاں ملتا ہے۔ یو کے جلالی، اے وی گپتا، ڈی سی رینہ، مہندر بھاردواج کے علاوہ شری ٹی کے رینہ اور سردار تیجا سنگھ نے بھی تقریب سے خطاب کیا۔ مقررین نے شری لہر کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بہار اردو اکادمی کا شری لہر کو انعام دینے کے لیے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ تمام اردو دانوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ مقررین نے یہ بھی کہا کہ شری لہر کی کوششوں سے ریاستی و قومی سطح پر اردو کو فروغ ملا ہے۔ اس موقعے پر شری لہر کو ایک شال اور سند بھی پیش کی گئی۔ شری لہر نے نو کتابیں لکھی ہیں اور ان کے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' پر بہار اردو اکادمی نے 2006 کے انعام سے نوازا ہے۔ (ڈاک سے)

● جودھپور۔ حضرت افضل شاہ کے 80ویں عرس کے موقع پر بزم اردو اور درگاہ کمیٹی کے زیر اہتمام مشاعرہ رکھا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر منظر انصاری نے کی۔ ڈاکٹر فرید آفریدی مہمان خصوصی اور امین جودھپوری مہمانِ امتیازی تھے۔ مشاعرے میں شین کاف نظام، اے ڈی راہی، ڈاکٹر فرید آفریدی، منظر القادری، امین جودھپوری، ساغر القادری، سرفراز شاکر، ڈاکٹر نثار راہی، محمد افضل جودھپوری، اشراق الاسلام ماہر، امیش ساحل اور محترمہ کوشلیا اگروال نے کلام سنایا۔ آخر میں متولی سلیم خاں مہر نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نثار راہی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● کولکاتا، 9 جون۔ ڈاکٹر محمد زاہد کی مرتب کردہ کتاب ''صادق رائے بریلوی: کلام وفن'' کا اجرا مورخہ 9 جون 2007 کولکاتا میں ہوا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر شمیم انور صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی نے کی جب کہ نظامت کے فرائض مولانا آزاد کالج کے استاذ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر شہباز نبی (وائس چیئر پرسن، مغربی بنگال اردو اکادمی) نے کتاب کی رونمائی کی۔ مہمانان خصوصی میں جناب جمیل منظر، جناب شکیل انصاری، جناب خالد عباداللہ، حاجی قمرالدین ملک موجود تھے۔ کتاب کے مرتب کو مختلف تنظیموں کی طرف سے ہار پیش کیے گئے۔ اجرا کے بعد ڈاکٹر شہباز نبی نے کہا کہ انھیں کتاب کافی پسند آئی ہے۔ مگر اودھی بولی میں لکھی نعت نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔ انھوں نے اردو کے ساتھ دیگر مقامی بولیوں میں ادب تخلیق کرنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر ایس جی آئی حیدر نے صادق رائے بریلوی کی طنزیہ شاعری کی انفرادیت کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر نصرت جہاں نے اپنی تقریر میں مواد کی تعریف کرتے ہوئے چند تسامحات کی طرف اشارہ کیا۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر شمیم انور نے کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے گفتگو کی۔ ناشتے کے بعد تقریب کا اختتام شام کے ساڑھے چھ بجے ہوا۔ پروگرام میں ادب نوازوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

● جمشید پور، 12 جون۔ انجمن ترقی اردو ہند کی جمشید پور اکائی کے زیر اہتمام حسن نظامی کی کتاب ''جھارکھنڈ کے جدید غزل گو شعرا: تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ'' کا اجرا انجمن کے صدر ایس آر اے رضوی چھبن نے کیا۔ اسلم بدر رضوان واسطی اور سید احمد شمیم نے کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت ممتاز شارق نے کی جب کہ اظہار تشکر جاوید اختر انصاری نے کیا۔ اس سے قبل انور ادیب اور کتاب کے مصنف حسن نظامی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

● لدھیانہ، 2 جون۔ گذشتہ دنوں بزم صبیب کی طرف سے پنجاب میں رہ کر اردو کی خدمت کرنے والے افراد کو اعزازات سے نوازنے کے لیے ایک عظیم تقریب منعقد کی گئی جس کی صدارت پنجاب شعبۂ اقلیت کے چیئرمین جناب عتیق الرحمٰن لدھیانوی نے فرمائی جب کہ نظامت مجلس احرار اسلام کے قومی صدر مولانا حبیب الرحمٰن ثانی نے کی۔ اس موقع پر پنجاب کانگریس کے صدر جناب شمشیر سنگھ دولو مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ جن معززین کو اردو کی خدمت کے لیے نوازا گیا ان میں بہار کے ضلع سہرسا سے تعلق رکھنے والے نوجوان صحافی محمد مظہر عالم مظاہری کا نام سرفہرست تھا۔ مظہر عالم صاحب کو پنجاب میں اردو صحافت و کتابت کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو اردو کی طرف راغب کرنے کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ اعزاز میں 11000 روپئے کا چیک بھی شامل تھا۔

اس موقع پر جن دیگر معززین کو نشان اعزاز سے نوازا گیا ان میں پنجاب

کے معروف شاعر جناب غلام حسن قیصر، جناب جون اکبر راہی، مجلس احرار پنجاب کے صدر غازی عبیدالرحمٰن، جامع مسجد لدھیانہ کے شاہی امام مولانا لدھیانوی اور ان کے پرسنل سکریٹری محمد مستقیم احراری، دارالعلوم جالندھر کے پیرزادہ محمد ناصر، امرتسر کے حامد حسن قاسمی، مالیرکوٹلہ کے محمد سہیل فاروقی کے نام شامل ہیں۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں اردو کے قدردان موجود تھے۔

(ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

● ارریا، (بہار) 30 جون۔ ادبی و ثقافتی ادارہ ''ہم سب'' کے زیر اہتمام ڈاکٹر محمد شہزاد شمس کی کتاب ''عورت اور سماج'' کی رسم اجرا سرسید لائبریری ارریا میں انجام دی گئی۔ پروگرام کا افتتاح ڈاکٹر نول کشور داس نول نے شمع روشن کرکیا۔ صدارت کی ذمے داری کیپٹن ایس. آر. جھا نے نبھائی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ہندی ماہ نامہ ''سودیا'' کے مدیر پنڈت بھولا پرشاد پرنئی اور پروفیسر ادت کمار ورما، وائس پرنسپل ارریا کالج، ارریا موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت جناب رہبان علی راکیش نے کی۔ کتاب کا اجرا الحاج قمر مسعود صاحب ریٹائرڈ پرنسپل آزاد اکیڈمی ارریا کے ہاتھوں ہوا۔ تقریب کے کنوینر دین رضا اختر صاحب نے مصنف کا تعارفی خاکہ پیش کیا اور ''ہم سب'' کے سکریٹری جناب رضی احمد...... نے مختصراً کتاب پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں شہر کے ہندی اردو کے تقریباً سبھی ادیب، شاعر، صحافی، اور دانشور حضرات اس تقریب میں موجود تھے۔ ہندی افسانہ نگار وسنت کمار رائے نے کتاب پر تفصیلی بحث کی اور اس اہم کاوش کے لیے مصنف کی ستائش کی۔ پروفیسر عبدالرؤف، اوما شنکر اچل، افتخار احمد، بھولا پنڈت پرتی گوری شنکر یادو، طہ خاموش، معیز الدین اور ارشد انور الف نے بھی موقعے کی مناسبت سے اظہار خیال کیا۔ اپنے بین کیے اس موقع پر اردو خدمات کے لیے ادارہ ''ہم سب'' کی جانب سے جناب فرمان علی فرمان کو بھی ''خادم اردو'' کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

آخر میں ڈاکٹر شہزاد شمس نے کتاب کی تصنیف کی غرض و غایت بیان کی۔ پروگرام کے انعقاد اور اسے کامیاب بنانے میں احتشام الحق، پرویز عالم، ڈاکٹر ایس. آر. جھا، شہنواز اختر، احسان الحق عزمی، ڈاکٹر عبدالرب، افروز اختر، نوشاد عالم، شہیم باری وغیرہ پیش پیش تھے۔ **(ڈاک سے)**

مشاعرے

● چینئی۔ تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر اہتمام کلائی وانرارنگم، چینئی۔ ۲، کے ہال میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی کے چیئرمین اور وزیر برائے اعلیٰ تعلیم ڈاکٹر کے پنمڈی نے افتتاح فرمایا۔ نواب محمد عبدالعلی، پرنس آف آرکاٹ اور وائس چیئرمین، اردو اکادمی نے مہمانوں اور سامعین کا استقبال کیا۔

مدیر ''شاعر'' جناب افتخار امام صدیقی کے ابتدائی کلمات اور نعت پاک کی سماعت کے بعد، بین الاقوامی شاعر جناب مخمور سعیدی مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ مشاعرے کی نظامت کی فرائض جناب شمس تبریزی کو سونپے گئے۔

مہمانان شعرائے کرام میں مخمور سعیدی (دہلی) کے علاوہ افتخار امام صدیقی (ممبئی) صلاح الدین نیر (حیدرآباد) رؤف خیر (حیدرآباد) مظفر رزمی (مظفر نگر) حسن کاظمی (دہلی) محسن جلگانوی (حیدرآباد) رؤف رحیم (حیدرآباد) اور کمال احمد بلیاوی (ممبئی) شامل تھے۔ شاعرات میں محترمہ پریتا واجپائی (الہ آباد) اور محترمہ رعنا زیبا (دہلی) شامل تھیں۔

میزبان شعرا میں اکادمی کے انعام یافتہ شعرا کاوش بدری (آمبور) مختار بدری (کرشنا گری) اصغر ویلوری اور علیم صبا نویدی کے علاوہ قادر ظہیر، وقار نگری، حسن فیاض، مختار احمد اختر، اشفاق الرحمٰن مظہر، ملک العزیز، سجاد ظہیر، غافل مدراسی اور شاہد مدراسی شامل تھے۔ اراکین اردو اکادمی کے علاوہ عمائدین شہر اور دوسری اردو انجمنوں کے عہدہ داران اور خواص و عوام مشاعرے میں شریک رہے۔

صدر مشاعرہ جناب مخمور سعیدی نے اپنے کلام کے جادو سے سامعین کا دل جیت لیا۔ ان کے علاوہ جناب حسن کاظمی، افتخار امام صدیقی، جناب رؤف خیر، مظفر رزمی اور محترمہ پریتا واجپائی نے اپنے اپنے کلام سے مشاعرے کی فضا گرما دی۔ مشاعرہ تقریباً رات کے دو بجے اختتام پر پہنچا۔ اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری جناب محمد امان اللہ نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ **(ڈاک سے)**

● نئی دہلی، 2 جون۔ ادبی و ثقافتی تنظیم ملاقات کے زیر اہتمام، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی ملیالم شاعری کے مجموعے کے اردو ترجمے ''میرا سفر'' کے اجرا کے موقع پر ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پاکستان کے معروف شاعر عبدالغفور جوش نے کی۔ نظامت کے فرائض مرزا عارف بیگ نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر مدھیہ پردیش کے گورنر ڈاکٹر بلرام جاکھڑ، صدر جمہوریہ کے پریس سکریٹری ایم ایس خان، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی موجود تھے۔ اس موقعے پر مندرجۂ ذیل شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ عبدالغفور جوش، وسیم بریلوی، اجمل سلطانپوری، معراج فیض آبادی، مظفر رزمی کیرانوی، ساغر خیامی، راحت اندوری، ڈاکٹر کلیم قیصر، شہزاد احمد شہزاد، حق کانپوری، ڈاکٹر نسیم نکہت، فرحت شہزاد، طاہر فراز، شکیل شفائی، دنیش رگھوونشی اور ان کے علاوہ ہندی کے معروف مزاح نگار سریندر شرما نے اپنی کویتاؤں اور لطیفوں سے سامعین کو لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کردیا نیز سویتا اسم نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

● نئی دہلی، 14 جون۔ اعجاز انصاری کے شعری مجموعے ''تنہا نہیں ہوں میں'' کے اجرا کے موقع پر ''سویرا'' کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد غالب اکادمی میں کیا گیا، جس کی صدارت ممتاز شاعر اور ادیب مخمور سعیدی نے کی جب کہ افتتاح اوکھلا حلقے کے کونسلر انجینئر جمال الدین نے شمع روشن کر کے کیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور اسمبلی رکن پرویز ہاشمی مہمان خصوصی اور اظہر انصاری مہمان ذی وقار کے طور پر موجود تھے۔ اس موقع پر معین اختر انصاری کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ مومن میڈیا کے ''اعجاز انصاری نمبر'' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ سید مجیب احمد، وسیم مرزا، پپو چودھری، عبدالحق، مستقیم عالم، اشرف جمال وغیرہ نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں مخمور سعیدی نے کہا کہ اعجاز انصاری ان شعرا میں شامل ہیں جن کا کلام مشاعروں میں بھی پسند کیا جاتا ہے اور کاغذ پر آکر بھی اپنی دلکشی قائم رکھتا ہے۔ مشاعرہ کی نظامت معین شاداب نے کی۔ مشاعرہ کا آغاز صبیحہ شکیل کی روح پرور آواز میں نعت سے ہوا۔ مشاعرے میں شریک شعرا کے نام ہیں: مخمور سعیدی، گلزار دہلوی، مظفر حنفی، احمد کمال پروازی، متین امروہوی، جاوید عرشی، ساحل سحری، شہباز ندیم ضیائی، شکیل حسن شمسی، اعجاز انصاری، ندیم نیر، کریم اثر للت پوری، ضیا رانا، حلیم رانا، آصف بریلوی، ملک زادہ جاوید، شائستہ ثنا، راشد حامدی، معین شاداب، شعیب مرزا، اسرار چندیروی، ثمر نور پوری، کشش وارثی، وارث وارثی اور ونیس لکھنولوی۔ اس موقع پر موجود معززین میں سید مرغوب حیدر عابدی، مشقت حسین (اسکول انسپکٹر) شبن علی ہاشمی، حبیب احمد، منصور احمد، ایم جی مغل، اسرار قریشی، شمس رمزی، آصف نظر، نفیس پرویز، انجم عثمانی، ریحان احمد عباسی، امین احمد خاں، امین ایڈوکیٹ، سید راغب الدین، شمیم احمد، امین اعظمی، سکندر عاقل، نفیس پرویز نور پوری، راشدہ باقی حیا، شمیم القادری سیوہاروی کے نام قابل ذکر ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سردھنہ، 28 جون۔ سردھنہ کے سالانہ ثقافتی میلے بوڑھا بابو میں روایتی کل ہند مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ پانچ دہائیوں سے زائد عرصے سے مسلسل میلہ پنڈال میں منعقد ہونے والے اس کل ہند مشاعرے کا افتتاح سابق کابینہ وزیر نواب کوکب حمید نے کیا۔ صدارت سابق ممبر اسمبلی عبدالوحید قریشی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے آئی جی میرٹھ زون وی کے گپتا، ڈی ایم میرٹھ مکیشور کمار، پولیس کپتان وجے پرکاش شریک بزم ہوئے۔ سابق وزیر آبپاشی ڈاکٹر معراج الدین احمد نے شمع روشن کی۔ مشاعرہ کنوینر آغا عین الدین شاہ نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔ نظامت معراج فیض آبادی نے کی۔ حامد بہرائچی کی نعت پاک سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ حسب ذیل شعرا نے کلام سنایا۔ پروفیسر وسیم بریلوی، معراج فیض آبادی، نعیم اختر برہانپوری، راحت اندوری، جوہر کانپوری، حامد بہرائچی، جمیل خیرآبادی، شبینہ ادیب، عزم شاکری، علیم نظر سردھنوی، منظر بھوپالی۔ عبدالستار رضا لکھنولوی، عقیل نعمانی، عظمیٰ پروین صبا اور شریف بھارتی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● علی گڑھ، 21 جون۔ آذر اکادمی علی گڑھ کے زیر اہتمام کھور میرٹھ سے تشریف لائے بزرگ، کہنہ مشق شاعر اسرار الحق اسرار کے اعزاز میں شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر سید ضیاء الدین شمسی تہرانی نے فرمائی۔ بحیثیت مہمان خصوصی ڈاکٹر معظم علی خاں اور سامنی سے تشریف لائے ہندی کے کوی حنیف صندلی نے نشست کا وقار و افتخار بلند کیا۔ بحیثیت مہمان ذی وقار متھرا سے تشریف لائے بزرگ شاعر حاجی محمد احمد خاں تابش کی شرکت نے محفل کو رونق بخشی۔ نظامت ڈاکٹر بدرالدجیٰ نے انجام دیے۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر شمسی تہرانی نے شاعری کے اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ اخبار راشٹریہ سہارا کے کھور سے نمائندے ممتاز صاحب اعزاز شاعر اسرار الحق اسرار نے کہا کہ آذر اکادمی نے مجھے جس اعزاز سے نوازا ہے میں اس کو کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ مشرف حسین محضر اور ڈاکٹر مجیب شہزر نے اپنے مرحوم استاد آذر صاحب کی یادوں کو سجائے رکھا ہے۔ اس دور میں یہ کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے بعد نشست کا آغاز مجیب شہزر کی نعت شریف سے ہوا۔ شریک شعرا تھے شمسی تہرانی، اسرار الحق اسرار کھوروی، ڈاکٹر معظم علی خاں، مولانا شمیم بستوی، طالب محمود، مشرف حسین محضر، مجیب شہزر، حنیف صندلی، سرور مارہروی، دانش مارہروی، ڈاکٹر سرور احمد، حاجی محمد احمد تابش متھراوی، نسیم ناز سامنی، مناعزیز، جاوید اختر وارثی، ڈاکٹر ظہیر ساحل، زاہد نور، ناصر سیفی، صوفی یوسف ہاتف۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● امروہہ، 25 جون۔ مشہور سماجی کارکن اور شاعر معصوم امروہوی کی پہلی برسی کے موقع پر آل انڈیا گنگا جمنی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر منظر عباس نقوی سابق صدر شعبۂ اردو اے ایم یو نے کی۔ مہمان خصوصی حاجی محمد حیات (سابق ایم ایل اے امروہہ) نے شمع روشن کی۔ ول کشور نے سرسوتی وندنا اور ناظم امروہوی نے نعت پاک سے محفل کا آغاز کیا۔ نظامت ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔ شعرا تھے ساغر خیامی، ڈاکٹر عظیم امروہوی، سیفی امروہوی، کے کے سنگھ مینک، شمیم نقوی، شفاعت فہیم، شہزادہ گلریز، اقبال اشہر، بیباک امروہوی، ندیم عرشی، نظیر باقری، عقیل نعمانی، پرچم نقوی، خورشید حیدر، زبیر ابن سیفی، جمشید امروہوی، ڈاکٹر لاڈلے رہبر، فیاض رائے بریلوی، امیر الدین تھمن، پنڈت بھونیش کمال۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● سنبھل، 4 جولائی۔ معروف شعرا اصغر سنبھلی اور حق سنبھلی کی یاد میں دیپا سرائے سنبھل میں کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا جو کہ بعد نماز فجر بھی کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ مہمان خصوصی چیئرمین میونسپل بورڈ حاجی نصرت الٰہی قریشی نے کہا کہ مشاعرے اردو زبان و ادب کے فروغ کا بہترین ذریعہ ہیں اور ان کا مسلسل انعقاد ہوتا رہنا چاہیے۔ مشاعرے کا آغاز رضوان مسرور نے حق سنبھلی اور اصغر سنبھلی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کیا۔ نعت شریف کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرا شریک تھے ڈاکٹر ماجد دیوبندی، خوشبو شرما، فخری میرٹھی، خورشید حیدر، منظر کرتپوری، رام اوتار جمال، الطاف ضیا، ندیم نیر کانپوری، فاخر ادیب، ثنا سنبھلی، آزاد بلگرامی اور ڈاکٹر مکیش درپن۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● لکھنؤ، 13 جون۔ قلم کاران اودھ کا ماہانہ غیر طرحی گنگا جمنی مشاعرہ کرشن مراری یادو کی رہائش گاہ مراری نگر اندرانگر میں زیر صدارت پی اے بہادر محشر بریلوی ہوا جس کی نظامت عمران انواروی نے کی۔ مشاعرے میں معروف شاعر پربھات شنکر اندوشریواستو کے سانحۂ ارتحال پر تنظیم کی جانب سے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ مرحوم والی آسی کے شاگردوں میں تھے۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرا نے شرکت کی:

محشر بریلوی، رام پرکاش بیخود، خلیل احسن، نجے مشرا شوق، عالم بارہ بنکوی، معراج ساحل، اسرار لکھنوی، وقار بارہ بنکوی، کرشن مراری یادو، راز ملیح آبادی، گلشن بریلوی، عمران انواروی، کے کے سنگھ مینک، قمر سیتاپوری، اسحاق نانپاروی، جمیل احمد جمیل، اروند اثر، عقیل غازی پوری، عرفان لکھنوی، فرحت لکھیم پوری، قیصر مظفر پوری، ساحل عارفی، دھننجے راجگری اور وکیل احمد جمالی۔

(راشٹر سہارا، نئی دہلی)

● امروہہ، 5 جولائی۔ یوپی اردو ادب سوسائٹی کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرہ اے کے انٹر کالج میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت راشد علوی ایم پی نے کی اور مہمان خصوصی شری پرکاش جیسوال نائب وزیر داخلہ تھے۔ مہمانان ذی وقار حاجی محمد حیات سابق ایم ایل اے، محبوب حسین زیدی اور ایم این عباسی تھے۔ نظامت فاخر ادیب نے کی۔ شعرا تھے: نعیم اختر خاں، ڈاکٹر جمشید امروہوی، عزم شاکری، خورشید حیدر مظفر نگری، ندیم منیر، شائستہ ثنا بہیڑی، ڈاکٹر درپن مظفر نگری، شرف نانپاروی، اقبال اشہر، فخری میرٹھی، نزہت نگار، نزہت امروہوی اور سکندر حیات گڑبڑ۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 10 جولائی۔ دہلی اردو اکادمی اور پندرہ روزہ قومی قافلہ کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں ایک تقریب تقسیم ایوارڈ اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد نے کی جب کہ دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال احمد فاروقی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ دوسرے مہمان خصوصی مشکور علی تھے۔ مشاعرے کی شمع حاجی عبدالسعید نے روشن کی۔ اس موقع پر میونسپل کونسلر حاجی تاج الدین، ڈاکٹر زین العابدین، ستیش کمار بیدی، حاجی عقیل بخش، معین اختر انصاری، محمد طاہر اور مکیش کمار کو اردو خدمات کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں تقریب کے دوران لرنیم ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے دسویں اور بارھویں کے امتحان میں اردو میڈیم میں بہترین کارکردگی پیش کرتے ہوئے امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بعد ازاں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مندرجۂ ذیل شعرا شریک ہوئے۔ شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی، انور باری، رؤف رضا، سلیم صدیقی، آرزو خورجوی، صالحین فہمی، شاہد انور، معین شاداب، اقبال فردوسی، اقبال اشہر، اسرار چندیروی، وسیم نادر ٹکرالوی، جاوید سعید، سلیم کاشف اور صدف برنی۔

جانے والوں کی یاد

منظور دہلوی

● نئی دہلی، 14 جولائی۔ 60 سالہ منظور دہلوی جو کئی ماہ سے بیمار تھے، 12 جولائی کو جمعرات کے دن ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ نظمی سکندر آبادی کے شاگرد تھے۔ منظور دہلوی ایک مخلص اور نیک انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا انتقال دہلی کے ادبی حلقے کے لیے ایک صدمہ ہے۔

یاور حسین یاور

● لکھنؤ، 17 جون۔ بزرگ شاعر سید یاور حسین کا گذشتہ شب تقریباً ساڑھے بارہ بجے ایرا میڈیکل کالج میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 82 برس تھی۔ مرحوم کو آج کربلا تالکٹورہ میں کثیر تعداد میں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کردیا گیا۔ مرحوم کا شعری مجموعہ "کلام یاور" کے نام سے اردو اکادمی سے شائع ہو چکا ہے۔ یاور صاحب پہلے لڈن صاحب بہار کے تلامذہ میں شامل تھے بعدہٗ فضل لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹا دلبر حسین رضوی اور دو بیٹیاں ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

□□□

تبصرہ وتعارف

● لفظ۔۔(شعری مجموعہ)
شاعر: آلِ احمد سرور
صفحات: 95، قیمت: -/64 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، نئی دہلی-66
مبصر: رئیس احمد، شعبۂ اردو، موہن لال سوکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور، راجستھان

اردو ادب کے عصری منظرنامے میں پروفیسر آلِ احمد سرور کی شناخت ایک دیدہ ور ناقد اور ادیب کی ہے جب کہ بہ طور شاعر ان کی شناخت ثانوی حیثیت رکھتی ہے، لیکن مرحوم کی ادبی شخصیت کے مجموعی مطالعے کے لیے ان کی شاعری کا مطالعہ نہایت ضروری ہے اور اسی کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس مجموعے کو زیور اشاعت سے آراستہ کیا ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے یہ مجموعہ دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی حصہ سرور صاحب کی تیرہ پابند اور آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں 1949 تا 2000 کی درمیانی مدت میں کہی گئی ہیں۔ ان میں بعض وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو ان کے تیسرے مجموعے ''خواب وخلش'' میں شامل نہ ہوسکی تھیں۔ مجموعے میں شامل نظموں کے عنوانات بالترتیب اس طرح ہیں ۔۔ لفظ، نظم اور غزل، میں بھی زندہ ہوں، اپنی نظر تو ہوگی، قطعہ ۔۔ آنند نرائن ملا، اپنے علی گڑھ کی یاد میں، ڈاکٹر عبدالسلام کی نذر، ہمیں سکھایا گیا تھا، لمحے کے اسیر، دانشوروں کا زوال، نئے سال کی آمد پر، میرا سفر اور ذاکر صاحب کی واپسی پر۔ نظموں کے بعد 1972 تا 2000 کے درمیان کہی گئی غزلیں اور متفرقات شامل ہیں۔

مجموعے کے مطالعے سے پروفیسر سرور کے شاعرانہ اوصاف کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لفظیات کے بہتر سے بہتر استعمال کے قائل تھے اور روایت کے زبردست پارکھ تھے۔ بہ طور شعری اصناف نظم اور غزل کے امتیازات پر بھی ان کی نظر تھی اور وہ دونوں شعری اصناف کو یکساں اہمیت دیتے تھے۔ ان کی نظم ۔۔ ''نظم اور غزل'' ان کے اس رویے کی ترجمان ہے۔ علی گڑھ میں سرور صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا، اسی لیے علی گڑھ سے انھیں گہرا تعلق خاطر تھا۔ نظم ''اپنے علی گڑھ کی یاد میں'' میں وہ بہت جذباتی ہوجاتے ہیں:

آئے جب ماجد تو یادوں کا دریچہ کھل گیا
کیسے کیسے ہم سفیران چمن یاد آگئے
کیا نشاطِ زیست تھا، کیا کیف، کیا جوشِ جنوں
کتنے منظر انجمن در انجمن یاد آگئے

''ڈاکٹر عبدالسلام کی نذر'' اور ''ذاکر صاحب کی واپسی پر'' بھی جذبات نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ جذبات نگاری ان کی غزل گوئی کا بھی حصہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں عصری آگہی، انقلاب زمانہ، جدید سائنسی ترقیات اور ان کے مثبت ومنفی پہلوؤں کا اظہار بھی ہوا ہے:

زمانہ ہے کہ کروٹ لے رہا ہے
سرور اک آپ ہی کے مسئلے کیا

اب نہ باغوں کی مہک ہے اور نہ کھیتوں کی بہار
کارخانے کے دھوئیں کے زخم سہلاتے ہیں لوگ

وقت کی بات ہے یا شومیِ قسمت یارو
دیوزادوں پہ ہے بونوں کی حکومت یارو

سرور صاحب کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی کے علاوہ ارضیت بھی ہے جو ان کے کلام کو حقیقی زندگی کا ترجمان بناتی ہے۔ وقت اور اس کے پیدا کردہ مسائل ان کے ذوق شعر کو مہمیز کرتے ہیں:

سرور ایک خلش تھی جو عمر بھر نہ گئی
اسی خلش نے تراشیں حکایتیں بھی بہت

نئے منظر بھی اب کتنے پرانے ہوتے جاتے ہیں
حقائق چند لمحوں میں فسانے ہوتے جاتے ہیں

''لفظ'' پروفیسر سرور کا چوتھا اور آخری شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین شعری مجموعے ''سلسبیل''، ''ذوق جنوں'' اور ''خواب وخلش'' ان کی زندگی میں شائع ہوچکے تھے۔ انھوں نے اس مجموعے کو دسمبر 2001 میں ترتیب دیا تھا، جب وہ عمر کی آخری منزل میں تھے اور کافی بیمار رہنے لگے تھے۔ قومی اردو کونسل نے ان کے مرتب کردہ مجموعے کو جوں کا توں شائع کیا ہے جس میں بعض غزلیں صرف تین یا چار اشعار پر مشتمل ہیں۔ متفرقات میں 37 اشعار درج ہیں۔ مجموعے کے سرورق پر لکھا ہے ''لفظ۔۔ کچھ نظمیں اور غزلیں'' لیکن اندر لکھا ہے ''لفظ۔۔ نظمیں اور غزلیں''۔ یعنی یہاں لفظ ''کچھ'' چھوٹ گیا ہے۔ یہ پروف ریڈنگ کی غلطی کہی جاسکتی ہے۔ اس طرح کی کچھ غلطیاں اندرونی صفحات میں بھی نظر آتی ہیں۔

● درس بلاغت
مرتب: شمس الرحمٰن فاروقی
صفحات: 205، قیمت: -/67 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066
مبصر: محمد رضا، 224، ای مہاندی ہوسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

شعروادب میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ تشبیہ، استعارہ، تلمیح اور علامت وغیرہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ وہ فنی لوازمات ہیں جن سے شعروادب میں خوب صورتی، دل نشینی اور تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔ ان کی واقفیت کے بغیر شعری محاسن سے ہم لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مثلاً کوئی لفظ حقیقتاً فصیح یا غیر فصیح نہیں ہوتا بلکہ محلِ استعمال کے اعتبار سے فصیح یا غیر فصیح کہلاتا ہے۔ ''اوس'' اور ''شبنم'' ہم معنی لفظ ہیں، لیکن ان کا محل استعمال انھیں جداگانہ حسن عطا کر دیتا ہے۔ دو جملوں میں وہ باتیں کہہ جانا جو دس جملوں کی متقاضی ہوں، بلاغت کہلاتا ہے۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہے:

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

غالب نے شراب کا نام نہیں لیا ہے، لیکن اشاروں میں یہ بتا دیا ہے کہ اب جب کہ میکدہ چھوٹ چکا ہے، کسی بھی جگہ بیٹھ کر شراب پی جا سکتی ہے۔ خواہ مسجد، مدرسہ یا خانقاہ جیسی مقدس جگہ ہی ہو۔ غالب کی شوخی نے شعر کو کس قدر پرلطف کر دیا ہے۔ اسی طرح کے شعری لوازمات سے شعر میں حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ اس سے قارئین سمعی، بصری، شامی اور لمسی لذتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اس طرح کے شعری لوازمات سے واقفیت شعروادب کے ہر باذوق طالب علم کے لیے بے حد ضروری ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''درس بلاغت'' انھی امور کی وضاحت پر مبنی ایک جامع و مستند کتاب ہے جس میں عروض و بلاغت سے متعلق تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

''درس بلاغت'' شمس الرحمٰن فاروقی کی زیر نگرانی 1980 میں ترتیب دی گئی تھی جو 1981 سے 2002 کے درمیان چار بار شائع ہوئی۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں زیادہ تر مضامین جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے ہیں جو اردو زبان و ادب کے جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ علم بلاغت کے بھی ماہر ہیں۔ وہ ہر بات کو، خواہ کتنی ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو، بے حد سلیس اور آسان زبان میں واضح کرتے جاتے ہیں۔ 2005 میں اس کتاب کو قومی کونسل نے دوبارہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو فاروقی صاحب نے نظر ثانی کرتے ہوئے اس میں کچھ تصحیحات اور اضافے بھی کیے لیکن کسی وجہ سے نظر ثانی کردہ کتاب اب تک شائع نہ ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کونسل کی باگ ڈور سنبھالی تو اس کے کاموں میں تیزی آئی اور انھی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ''درس بلاغت'' کا تصحیح و اضافہ شدہ یہ پانچواں ایڈیشن 2007 میں منظر عام پر آ گیا۔

بارہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے باب اول میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ''بلاغت کیا ہے'' کے عنوان سے بلاغت کے رموز کو بڑے دل نشیں انداز میں سمجھایا ہے۔ بلاغت کے ساتھ ساتھ انھوں نے فصاحت کی بھی وضاحت کی ہے اور دونوں کے لوازم پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ باب دوم میں ڈاکٹر صادق نے ''علم بیان'' کے تحت تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اشعار کا حوالہ دے کر ہر نکتے کی وضاحت کی ہے۔ ابوالفیض سحر نے باب سوم میں ''صنائع معنوی'' پر اظہار خیال کیا ہے۔ موصوف نے شاعری میں مروج صنعتوں کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ مثلاً ادماج، ارصاد، استتباع، استخدام، استدراک، اطراد، اعتراض، ایرادالمثل، ایہام، تجاہل عارفانہ، تضاد، تلمیح، توجیہ، تنسیق الصفات، حسن تعلیل، حشو ملیح، لف ونشر، مراعات النظیر اور مکر شاعرانہ وغیرہ۔ ان تمام صنعتوں کی انھوں نے جامع تعریف پیش کی ہے۔ باب چہارم کے تحت ڈاکٹر یعقوب عامر نے ''صنائع لفظی'' کا ذکر کیا ہے اور ''صنائع لفظی'' کے ذیل میں آنے والی چیزوں کی برمحل اشعار کے ذریعے وضاحت کی ہے۔

باب پنجم، ششم اور ہفتم جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے تحریر کیے ہیں۔ باب پنجم میں انھوں نے عروض پر کچھ بنیادی بحث کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: ''شاعری کا مطالعہ عروض کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشعار الفاظ سے بنتے ہیں اور الفاظ مختلف طرح کی آوازوں کا مجموعہ ہیں۔ لہٰذا جب تک ان آوازوں کی نوعیت، ان کے میل، ان کے نمولوں، ان کی ہم آہنگی یا غیر ہم آہنگی کے بارے میں واقفیت نہ ہو، اس وقت تک اس بات کا پورا علم نہیں ہو سکتا کہ شاعری میں الفاظ کیا کام کرتے ہیں اور کس قسم کا کام کرتے ہیں۔'' (ص۔ 89) فاروقی صاحب نے عروض کے بنیادی مباحث کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ باب ششم کا عنوان ہے ''بحریں اور زحافات'' جس میں انھوں نے مروج بحور کا بیان کرتے ہوئے ہر بحر کی تشریح کی ہے اور اشعار کی تقطیع کرکے اس کے وزن و آہنگ کو سمجھایا ہے۔ باب ہفتم میں انھوں نے ''قافیہ'' سے بحث کی ہے۔ باب ہشتم میں شمیم احمد نے ''اقسام شعر'' اور باب نہم میں انوار رضوی نے ''اقسام نثر'' پر گفتگو کی ہے۔ باب دہم پھر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے قلم سے ہے جس میں انھوں نے ''کچھ عروضی اصطلاحات'' کی وضاحت کی ہے اور باب یازدہم میں ''اردو

اور انگریزی کی مشترک اصطلاحات'' کی فہرست پیش کی ہے۔ اس کتاب کا آخری باب شمیم احمد کا رقم کردہ ہے۔ اس میں موصوف نے ''موجودہ عہد میں علوم بلاغت کی اہمیت'' پر روشنی ڈالی ہے۔ کتابیات کے تحت ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے مزید تفصیلی واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اخیر میں اشاریہ درج ہے۔

''درس بلاغت'' کے تمام مشمولات بے حد وقیع اور گراں قدر ہیں۔ مضامین میں قطعیت اور جامعیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ تمام مضامین اپنے موضوعات کا مکمل احاطہ کرتے ہیں اور ہر مضمون پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ اس کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

● **عبدالحلیم شرر: بہ حیثیت ناول نگار**
مصنف: علی احمد فاطمی
صفحات: 393، قیمت: -/165 روپئے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جے۔این۔یو، نئی دہلی-67

''عبدالحلیم شرر: بہ حیثیت ناول نگار'' پروفیسر علی احمد فاطمی کی یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جس میں شرر کے ناولوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''ہندوستان 1857 کے بعد'' ہے جس میں 1857 کے بعد ہندوستان کے سیاسی وسماجی منظرنامے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مصنف نے اودھ اور جنگ آزادی، شاہ ولی اللہ اور ان کی تحریک، سرسید احمد خاں اور ان کے کارنامے اور ایم۔اے۔او۔کالج جیسے ذیلی عنوانات قائم کرکے متعلقہ عہد کے ملکی حالات کو ہر سطح پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

دوسرا باب بہ عنوان ''اردو ادب کی نئی راہوں سے شناسائی'' ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج، دلّی کالج اور ان کے کاموں سے بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں باب پس منظر کا کام کرتے ہیں۔ مصنف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال نہایت اختصار اور جامعیت سے پیش کرکے اپنے تاریخی شعور کا ثبوت دیا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے ''عبدالحلیم شرر: حیات اور ناول'' اس میں شرر کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، تعلیمی سفر، ملازمتوں اور علمی مشاغل پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں شرر کی صحافت سے وابستگی، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد وغیرہ کا ذکر ہے۔ نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اولین اشاعت کہاں اور کب ہوئی اس پر تحقیقی بحث کی گئی ہے۔

''تاریخی ناول: فن اور اصول'' چوتھا باب ہے جو تنقیدی اعتبار سے زیادہ باوزن ہے۔ مصنف نے تاریخ، ناول اور تاریخی ناول پر بہت جامع گفتگو کی ہے اور تاریخی ناول سے متعلق مختلف آرا اور بیانات کا محاکمہ کرتے ہوئے اس کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ناول میں ماضی کے وہ واقعات جو تخیل کے سہارے سجائے گئے ہوں تاریخی ناول کہلاتے ہیں۔

پانچویں باب کا عنوان ''شرر کے تاریخی ناول'' اور چھٹے باب کا عنوان ''شرر کے معاشرتی ناول'' ہے۔ شرر کے تاریخی ناولوں کی تعداد 34 ہے جسے فاطمی صاحب چار ادوار میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا دور 1886 سے 1890 تک، اس عرصے میں شرر کے چار ناول شائع ہوئے۔ دوسرا دور 1896 سے 1900 تک، اس درمیان ان کے چار ناول شائع ہوئے۔ تیسرا دور 1904 سے 1910 تک، ان سات برسوں میں شرر کے پانچ ناول شائع ہوئے۔ چوتھا دور 1913 سے 1925 تک، اس درمیان ان کے شائع ہونے والے ناولوں کی تعداد نو ہے۔ چھٹے باب میں شرر کے تاریخی ناولوں کے علاوہ سماجی، معاشرتی اور اصلاحی نوعیت کے ناولوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

آخری باب بہ عنوان ''عبدالحلیم شرر: مجموعی تاثر'' ہے۔ اس میں شرر کی پلاٹ سازی، منظرنگاری اور کردار نگاری سے متعلق معروضی انداز میں بحث کی گئی ہے نیز گذشتہ صفحات میں پیش کیے گئے بعض خیالات کی وضاحت کی گئی ہے۔ علی احمد فاطمی کی یہ کتاب عبدالحلیم شرر پر شائع ہونے والی کتابوں میں قابل ذکر اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔

● **انقلاب زنج**
مترجم: جاوید دانش
صفحات: 256، قیمت: -/200 روپئے
ناشر: حنفی ٹرسٹ، 11/14، جھاؤتلہ روڈ، کولکاتا-17
مبصر: ابوبکر عباد، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-7

اردو میں ایسے نوجوان جو ڈرامے لکھ رہے ہیں، ڈرامے کی تنقید لکھ رہے ہیں، دوسری زبانوں سے ڈراموں کے ترجمے کررہے ہیں اور عملی طور پر بھی اسٹیج سے منسلک ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس مختصر سی فہرست میں ظہیر انور، انیس اعظمی، شاہد انور، زماں حبیب اور جاوید دانش کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ فہرست کے بقیہ لوگوں کی تعداد بھی بمشکل اتنی ہی ہوگی۔ فی الوقت ہمارے پیش نظر جاوید دانش کی عالمی ڈراموں کے انتخاب اور ترجمے پر مبنی کتاب ''انقلاب زنج'' ہے۔ جاوید دانش کی پیدائش کلکتے میں ہوئی، تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور عرصے سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ انھوں نے 70 کی دہائی سے ڈرامے لکھنے شروع کیے تھے اور پروفیسر محمد حسن کے جریدے ''عصری

ادب''، پروفیسر قمر رئیس کے رسالے ''عصری آگہی'' اور کلکتے سے نکلنے والے رسالوں ''انشا'' اور ''مژگاں'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب تک ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں مثلاً ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''پرومیتھیس'' افریقی ادب کا ترجمہ'' کالے جسموں کی ریاضت'' عالمی لوک کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ'' ورثہ'' فلسطینی اور اسرائیلی ادب کا ترجمہ'' ایک باپ کی اولاد'' اور اب عالمی احتجاجی ڈراموں کا انتخاب و ترجمہ'' انقلاب زنج''۔ علاوہ ازیں یورپ اور امریکہ کا سفرنامہ'' آوارگی'' جاپان و ہانگ کانگ اور بنکاک کا سفرنامہ ''مزید آوارگی'' بھی ان کی فہرستِ تصانیف میں شامل ہیں۔ ان کی شہرت اور اعتبار کا سبب ان کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ'' ہجرت کے تماشے'' بنا۔

''ہجرت کے تماشے'' کے پانچوں ڈراموں میں شمالی امریکہ میں مقیم ایشیائی لوگوں کے ذہنی، تمدنی اور روحانی کرب کو موضوع بنایا گیا ہے جو دیار غیر میں معاشی اور معاشرتی مسائل اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت سے گزر رہے ہیں۔ ان ڈراموں میں ڈاکٹر اور انجینئر، شاعر و ادیب، تاجر و مزدور، طلبہ اور مہاجرین کی نئی اور پرانی نسل کی زندگی اور نفسیات کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''انقلاب زنج'' دنیا کے گیارہ احتجاجی ڈراموں پر مشتمل ہے۔ مجموعے کا پہلا ڈراما ''انقلاب زنج'' عربی زبان کے ناقد، ناول نویس اور ڈرامہ نگار عزیز الدین مدنی کے'' دیوان الزنج'' کا ترجمہ ہے۔ تیونس کے پس منظر میں نسلی امتیازات کے موضوع پر لکھا گیا یہ ایک ایسا ڈراما ہے جو اس خطۂ ارض کے فرسودہ نظام کو سامنے لاتا ہے۔ یہ ڈراما ایک غیر یقینی صورت حال کا اعلامیہ بھی ہے، احتجاج بھی اور عزم و حوصلے اور خوش آئند مستقبل کا خواب بھی۔ ''دلدل کے باسی'' اور'' سخت جاں نسل'' افریقہ کے نوبل انعام یافتہ سوئنکا کے ڈراموں کے ترجمے ہیں۔ دونوں کا مرکزی موضوع توہم پرستی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے عملی، بدحالی اور تساہل پسندی ہے۔ اول الذکر ڈراما شہری زندگی کی سخت دلی اور زر پرستی پر بھرپور طنز بھی ہے۔ دونوں ڈرامے علامت نگاری اور باطن کے اظہار کی عمدہ مثال ہیں۔ ''ننگے پاؤں'' کینیڈا کی مشہور مصنفہ، معروف مصور اور سماجی کارکن شرلی چی چو کے ڈرامے کا ترجمہ ہے، جو نفرت کے جذبے سے شروع ہو کر عالمی برادری اور بشر دوستی کی آرزو پر ختم ہوتا ہے۔ ''سموم'' سوئیڈش ڈراما نویس، فکشن نگار اور شاعر آگسٹ اسٹرنڈبیری کے ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ ڈرامے کی تھیم الجزائر پر فرانسیسی تسلط کے خلاف جدوجہد ہے۔ سموم وہ ریگستانی آندھی ہے جو محبانِ وطن کے لیے آزادی اور قابضوں کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتی ہے۔ ڈرامے کا اہم کردار عربی نسل کی سیاہ فام خانہ بدوش لڑکی ''بسکارا'' دشمنوں سے نفرت کا عمدہ استعارہ اور وطن پرستی کی خوب صورت علامت ہے۔ ''پہلی کرن'' آئرش مصنفہ لیڈی گریگری کے ڈرامے Rising of the Moon کا اردو روپ ہے، جس میں حکومت برطانیہ کی نمائندگی کرنے والے حاکم اور ایک باغی شاعر کے درمیان کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔ ڈرامے میں مقامی رنگ پیدا کرنے کے لیے باغی شاعر کو ہندوستان کے مجاہد آزادی اور شاعر حسرت موہانی کا نام دے کر ہندوستانی ماحول میں ڈھالا گیا ہے۔ ''پراسرار محبت'' تین بار نوبل پرائز کے لیے نامزد ہونے والے جاپان کے باغی تخلیق کار یوکی میشیما کے ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ یہ مجموعے میں شامل دوسرے ڈراموں سے قدرے مختلف ہے۔ اس ٹریجڈی میں مادام ''اوئی'' کی یک طرفہ محبت، رقابت اور انتقام کی کہانی ڈرامائی کشمکش اور تجسس کی فضا میں بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہے۔ ''کوئی ہے'' امریکی ناول نگار اور ڈراما نویس ولیم سرویان کے ڈرامے Hello out there کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک تیز رفتار کرائم سسپنس ہے، جس میں امریکہ میں غیر ملکیوں کے احساس تنہائی کا بیان اور ان کے ساتھ ہونے والی سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ آخری تین ڈرامے بنگلہ سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ پہلا ڈراما ''چنڈالیکا'' رابندر ناتھ ٹیگور کا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ڈانس ڈرامے ہیں جو اونچ نیچ اور ذات پات کی تفریق پر مبنی ہے۔ ''شاہ جہاں'' بولائی چند مکھوپادھیائے کی بنگلہ کہانی ہے جسے اشوک چٹرجی نے ریڈیائی ڈرامے میں تبدیل کیا تھا اور اب اردو ترجمے کے طور پر اس مجموعے میں شامل ہے۔ مجموعے کا آخری ڈراما ''پرومیتھیس'' ترن دیپ سرکار کا ہے جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ پرومیتھیس ہی بغاوت کا سرچشمہ ہے جو ہر صدی میں پیدا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

تمام ڈرامے مختلف مقامات سے تعلق رکھنے اور مختلف واقعات پر مبنی ہونے کے باوجود ایک مرکزی موضوع احتجاج کے دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔ ڈراموں کے پلاٹ میں کسی طرح کا جھول نہیں ہے، کہانی کے برتاؤ میں ایک خاص سلیقہ نظر آتا ہے، مکالمے اور اسلوب بیان حسب حال ہیں اور زبان عام فہم۔ البتہ بیشتر ڈراموں کا ماحول ہندوستانی معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے Transcreation کے نام پر بھلے ہی خوبی گردانیں لیکن یہ ترجمے کا عیب ہے کہ ہم واقعات رونما ہونے والے علاقوں کے جغرافیائی حالات اور وہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی زیارت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بعض ڈراموں میں غیر ملکی لوک گیتوں کی تقلیب اردو گیتوں سے کی گئی ہے اور کہیں اصل زبان کے اشعار کی جگہ اردو اشعار و اقوال کا استعمال کیا گیا ہے۔ ڈرامے، تراجم اور عالمی شہرت کی تخلیق پڑھنے کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اچھا تحفہ کہی جاسکتی ہے۔

● جدید افسانہ: تجربے اور امکانات

مصنف: آصف اقبال

صفحات: 252، قیمت: -/175 روپئے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں، دہلی-6

مبصر: شاذیہ عمیر۔ 352-E/C، جی بلاک، منیر کا گاؤں، نئی دہلی- 110067

"جدید افسانہ تجربے اور امکانات" آصف اقبال کی پہلی تنقیدی کاوش ہے، جس میں انھوں نے ابتدا سے لے کر آج تک اردو افسانہ ہیئت اور تکنیک کے جن مراحل سے گزرا اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے میں ہیئت اور تکنیک کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے مختلف دانشوروں کی آرا پیش کرتے ہوئے مصنف نے اپنے موقف کی وضاحت اس طرح کی ہے: "جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہیئت کسی فن پارے کو مخصوص طریقے سے پیش کرنے کا نام ہے لیکن اس میں خاص نظم و ترتیب کے ذریعے موضوع اور نقطۂ نظر کو مواد سے بالکل ہم آہنگ ہونا چاہیے، جو کسی الجھن کے بغیر قاری کو اس طرح متاثر کردے کہ وہ کوئی فنی سوال نہ کھڑا کر سکے۔ ظاہر ہے اس میں موزوں الفاظ، بہترین تکنیک اور منفرد اسلوب کا بھی کافی اہم رول ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں کسی بھی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" دوسرے حصے میں تکنیکی اور اسلوبیاتی اصطلاحات کے تحت بیانیہ، شعور کی رو، تلازمۂ خیال، فلیش بیک، داستانی، اعترافی، علامتی، تجریدی، سرریلزم، میجک ریلزم اور مونتاژ وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان سب کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں اور یہ ایک دوسرے سے کس طرح مختلف ہیں۔

دوسرا باب اردو افسانے میں ہیئتی اور تکنیکی تجربات کی روایت پر مشتمل ہے۔ اس میں پریم چند سے لے کر سعادت حسن خاں منٹو تک اردو افسانہ ہیئت اور تکنیک کے جن مرحلوں سے گزرا اس پر بحث کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اس عرصے میں اردو افسانے پر زیادہ تر بیانیہ، نفسیاتی، اسطوری اور جنسی رجحانات حاوی رہے ہیں۔ تیسرے باب میں جدید اردو افسانے کے محرکات اور 1960 کے بعد مختلف رجحانات پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جدیدیت، تنہائی، محرومی، حرماں نصیبی اور قنوطیت کا نام نہیں بلکہ اس میں زندگی کے روشن پہلو، انسان کی عظمت اور خوش نصیبی کا اثبات بھی موجود ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زبان کے مروجہ تصور سے انحراف کرتے ہوئے زیادہ تر تجریدی اور علامتی افسانے بھی تخلیق کیے گئے ہیں۔

چوتھے باب میں 1960 کے بعد کے اہم افسانوں کا، ہیئت اور تکنیک کے تجربے کے لحاظ سے تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، بلراج مین را، سریندر پرکاش، انور سجاد، انور عظیم، احمد ہمیش، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، جوگندر پال اور کلام حیدری وغیرہ نے جس طرح حکایات، داستان اور ملفوظات کی تکنیک کے ساتھ تجریدی اور علامتی افسانے تخلیق کیے، ان سب پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور آزادی کے بعد اردو افسانے کے بنیادی رجحانات کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے رجحان میں تقسیم کے المیے، دوسرے میں زندگی کے نارمل حسن کو حقائق کے ساتھ پیش کرنے کا رجحان، تیسرا علاقائی افسانے تخلیق کرنے اور چوتھے رجحان کے تحت تجریدی اور علامتی افسانے پر گفتگو کی ہے۔ پانچواں باب اردو افسانہ نگاری پر ہیئتی اور تکنیکی تجربات کے اثرات پر مشتمل ہے ساتھ ہی اس میں آٹھویں دہائی کے بعد سے لے کر اب تک کے افسانے کے فنی رجحانات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ فکشن کی تنقید میں مواد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ہیئت اور تکنیک پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ اس لحاظ سے آصف اقبال کی یہ تصنیف ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید ہے ان کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

● "محبوب کے اعضائے رئیسہ"

مصنف: منظور عثمانی

صفحات 175: ، قیمت -/150 روپئے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں، دہلی-6

مبصر: یوسف ناظم، 19۔ اہلال، 13۔ باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی- 400050

کتاب کا نام دیکھ کر تو میں ڈر گیا کہ کہیں یہ باتصویرانہ ہو۔ کتاب کھولی تو جان میں جان آئی۔ فاضل اور مشاق مصنف نے اعضائے رئیسہ کو تقریباً مخفی ہی رکھا ہے۔ صرف الفاظ کا جامہ پہنایا ہے انھوں نے اپنے محبوب کے اعضائے رئیسہ کو جو گنتی میں حسن اتفاق سے زیادہ نہیں ہیں۔ اعضائے بدن میں یہ رئیسہ نام کے اعضا، شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اقلیت میں ہیں۔ ہم ہندوستانیوں اور خاص طور پر شعرا و ادبا کی سوچ، ذرا مختلف ہے اور کشادہ دلی کی تابع، اردو کے بڑے اور اہم شاعر فراق تک نے محبوب کے اعضائے رئیسہ کا شمار کرنے کی خاطر اسے بے لباس کرنے میں دریغ نہیں فرمایا۔ ہمارے محبوب مزاح نگار منظور عثمانی نے جنھیں دس تا چدرہ ہزار اشعار "منہ زبانی" یاد ہیں اپنے آپ کو شرعی حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیا اور شاید ان کی اسی روش نے محترم سید حامد اور مکرم سید اوصاف علی کو اپنے اپنے رشحاتِ قلم بطیبِ خاطر سپردِ قرطاس کرنے پر آمادہ کیا۔ ان دونوں صاحبانِ علم و فضل کے نتائج فکر نے منظور عثمانی کو اہلِ نظر کا منظورِ نظر بنا دیا۔ ویسے منظور عثمانی اپنی طبع ظرافت شعار کے زیر اثر ہیں بڑے شاطر اور اپنے مضامین کے عنوانات منتخب کرنے میں اتنے ظریف الطبع ہیں کہ ان کی تصنیفات کے قاری ان سے تقریباً بدظن ہو جاتے ہیں۔ یہ بدگمانی خود مصنف کی پھیلائی ہوئی ہے۔ 14 مضامین کے

اس شوخ رنگ مجموعے میں مصنف کے 14 بے ساختہ مضامین شامل ہیں اور ان 14 مضامین کے عنوانات آپ ملاحظہ کریں تو پورے 14 عدد طبق روشن ہوجائیں۔ دوچار مثالیں ''رہنمایان قوم کی پیازانہ زیست، بوسم بوسہ، شیر دل بکرا، بزدل شیر، شاید وہ اپنے کسی آئندہ وارد ہونے والے مضمون کا عنوان لکھیں، شیر شور انگیز، (فاروقی صاحب توجہ فرمائیں) منظور عثمانی صاحب کی اس خوبی (جو کمال کے درجے کی ہے) کا کیا کہنے کہ ان کا ایک مضمون پڑھتے تو شاعروں کے کئی دیوان کے اعضائے رئیسہ نگاہوں میں گھومنے اور ذہن میں شہد گھولنے لگتے ہیں۔ محترم کی زندگی کا تانابانا شعری ہے روز وشب شعری ہیں اور خوردونوش شعریات ہیں۔ قلم ان کا دوڑتا ہے اور شاید اسی لیے ہمارے محاورہ اور روزمرّہ ساز اصحاب فکرونظر نے ''اشہب قلم'' کی ترکیب بہت پہلے وضع کرلی تھی اور منظور عثمانی تو ہیں ہی اس خیال کے حامی کہ ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ لیکن اپنے مزاج کے تلون سے انھیں مفر نہیں ہے۔ ان کی شگفتگی اور شوخی کا مظاہرہ ان کے اس مضمون میں ہوتا ہے جس کا عنوان ہے'' میاں بیوی کی نوک جھونک فطری۔'' اس مضمون کو منظور عثمانی نے اپنے زورِ قلم، اور شور ظرافت سے نوک جھونک کو کھینچا تانی تک پہنچادیا ہے۔ اس کے آگے ہمارا طائر تخیل پرواز نہیں کرسکا۔ اصل قصہ یہ ہے کہ منظور عثمانی کی کھلنڈری طبیعت مانتی نہیں ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں بہت دور نکل جاتے ہیں اور ہوسکتا ہے چونک کر اٹھنے کے بعد افسوس کرتے ہوں کہ ہائے بات صرف تصور تک کیوں رک گئی۔ منظور عثمانی یقین مانیے میدان ظرافت کے منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ اسٹیٹ فارورڈ بھی ہیں اور گول کیپر بھی ہے۔ ان کی شرع میں سیلف گول بھی مستحب ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ گھر کے باہر کم ہی جاتے ہیں۔

فاضل اور ظریف مصنف کی تازہ تصنیف ''محبوب کے اعضائے رئیسہ'' کا مطالعہ یعنی صرف مطالعہ کیجیے مشاہدے کی زحمت سے بچیے۔ ویسے یہ تخیّل بھی شکم سیری کے لیے کافی ہے!!

□□□

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب وتاب عطا کی اور ایک منفرد لب ولہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش وخروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت -/300 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

خسرو متین

(بچوں کا گوشہ)

چھتری کی کہانی

بارش اور دھوپ سے بچنے کے لیے چھتری کا استعمال کرنا ایک عام بات ہے۔ شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جہاں چھتری کا استعمال نہ ہوتا ہو۔ آج بازار میں مختلف ڈیزائن، سائز اور خوبصورت رنگوں کی چھتریاں با آسانی مل جاتی ہیں لیکن چھتری کو موجودہ شکل اختیار کرنے اور پوری دنیا میں اپنے پر پھیلانے میں تقریباً دو ہزار سال کا سفر طے کرنا پڑا۔ چھتری کا یہ سفر بڑا دلچسپ ہے۔ آیئے! اس سفر پر ایک نظر ڈالتے ہیں

ہمارے یہاں چھتری کو چھاتا بھی کہا جاتا ہے۔ بلکہ ابتدا میں چھاتا لفظ کا ہی زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ چھاتا لفظ دو لفظوں ''چھ'' اور ''تا'' سے مل کر بنا ہے جس کا مطلب ہے سر پر سایہ کرنے والا۔ کئی ممالک میں چھتری کو شان اور وقار کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ قدیم یونانی مذہبی صحیفوں میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ وہاں کے مذہبی رہنما کھجور اور ناریل کے پتوں سے بنے چھاتے سر پر لگا کر عبادت گاہوں میں جاتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح دیوتاؤں کا دیدار ہوجاتا ہے۔ ہندوستان کی کچھ لوک کتھاؤں کے مطابق سورگ کی دیویاں ''اروشی'' اور ''مینکا'' کہرے اور پھولوں کی چھتریاں لگا کر آسمان کی سیر کیا کرتی تھیں۔ جب وہ کسی دیوتا کے دربار میں جاتیں تو چھتری کو تحفے کے طور پر وہیں چھوڑ آیا کرتی تھیں۔ روایت ہے کہ ان کے چھاتوں کو دیکھ کر ہی مندروں میں ''چھتر'' اور ''شکھر'' کا رواج ہوا۔

قدیم مصری تہذیب کی باقیات سے بھی چھاتے کے وجود کے ثبوت ملتے ہیں۔ روم کی قدیم عبادت گاہوں کی دیواروں پر آج بھی پنے اور سونے کی سیاہی سے بنی چھاتوں کی تصاویر واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

چھاتے کی ایجاد کب اور کیسے ہوئی؟ اس سلسلے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یونان کے مذہبی صحیفوں کے مطابق ساتویں صدی میں یونان کے کچھ آدی واسیوں نے گرمی اور دھوپ سے بچنے کے لیے شیر کی کھال سے ایک چھاتا بنایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق دنیا کا پہلا چھاتا چوکور تھا جو یونان کے ایک پادری نے بنایا تھا۔ اس چھاتے کو بنانے کے لیے کیلے کے پتوں کو آپس میں جوڑا گیا تھا۔ جس وقت وہ پادری چرچ میں جاتا تھا اس وقت اس کے ہاتھوں میں یہی چھاتا ہوتا تھا۔ پادری کا بنایا ہوا چھاتا لوگوں میں بہت مقبول ہوا اور چرچ میں آنے والے لوگ بھی اس طرح کا چھاتا استعمال کرنے لگے۔

تقریباً ایک صدی تک چھاتے شیر کی کھال، ناریل اور کھجور کے پتوں سے بنائے جاتے رہے لیکن اس وقت تک ان کا استعمال

صرف دھوپ سے بچنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جب چھاتا چین پہنچا تو وہاں اس میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ کھال اور پتوں کی جگہ کپڑے کا استعمال کیا جانے لگا اور اب اسے دھوپ سے بچاؤ کے علاوہ بارش سے بچنے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ چین نے ہی موجودہ چھتری کا صحیح استعمال بتایا۔ میدان جنگ میں رتھوں اور دربار میں شاہی تخت پر چھاتے کا استعمال دھوپ کے علاوہ شاہی جلال اور دبدبے کے لیے بھی کیا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں کئی راجا اور مہاراجا مخمل اور سونے چاندی سے بنے اور ہیرے جواہر جڑے چھاتے لگا کر رعایا کا حال چال پوچھنے جاتے تھے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی تک یورپ میں چھاتے کا استعمال صرف شاہی خاندان کے افراد ہی کر سکتے تھے اگر کوئی عام آدمی چھاتے کا استعمال کرتا ہوا پکڑا جاتا تو اس کے لیے بڑی عجیب وغریب سزا تھی۔ تا عمر اسے پھٹا ہوا چھاتا لے کر شاہی خاندان کی غلامی کرنی پڑتی تھی۔ سولھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اٹلی میں چھاتے کی مقبولیت سماج کے ہر طبقے میں بڑھنے لگی۔ سترھویں صدی میں چھاتے کی ترقی یافتہ شکل نظر آنے لگی، اٹھارھویں صدی میں چھاتا انگلینڈ میں ایک مقبول ومحبوب شے بن گیا۔ لڑکیاں چھاتا لگا کر چلنا اپنی شان سمجھتی تھیں۔ انگلینڈ میں آج بھی اگر لوگ کسی کے یہاں مہمان جاتے ہیں تو چھتری ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔ اسے تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

میکسیکو میں چھاتا ٹوپ کی شکل کا ہوتا ہے جسے ہاتھ میں لے کر چلنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ اسے سر پر لگا لیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا میں کنواری لڑکیاں ہرے رنگ کا چھاتا استعمال کرتی ہیں۔ جاوا میں جب کسی شخص کی موت ہو جاتی ہے تو مرنے والے کی قبر پر چھاتا لگا دیا جاتا ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ قبر پر چھاتا لگانے سے مرنے والے کو بھوت پریت پریشان نہیں کرتے۔ ملیشیا کے لوگ خطرناک جانوروں سے بچنے کے لیے چھاتا لے کر دوڑتے ہیں اور اس انداز سے دوڑتے ہیں کہ شیر جیسا خطرناک اور بہادر جانور بھی حواس باختہ ہو کر دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ مختلف ممالک میں چھاتے کو نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ چھاتا ساتھ لے کر چلنے سے کام ضرور بن جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں چھاتا بنانے کا سب سے پہلا کارخانہ 16 جولائی 1902 کو ممبئی میں شروع ہوا۔ اس وقت کافی بڑے اور بھاری چھاتے بنتے تھے۔ آج ہمارے ملک میں تقریباً ایک ہزار سے زائد چھاتے بنانے کے چھوٹے بڑے کارخانے موجود ہیں، جن میں پورے سال کام ہوتا رہتا ہے اور تقریباً پانچ کروڑ چھاتے دنیا کے ساٹھ ملکوں میں برآمد کیے جاتے ہیں۔

چھاتوں کی یہ صنعت ہمارے ملک کے لیے زرمبادلہ فراہم کرنے کا بھی کام کرتی ہے۔

پتہ:

K-52, Batla House, Okhla, New Delhi-110025

□□□

سوہن راہی

بچوں کا گیت

چندا آئے تارا آئے
کرنوں کے وہ گیت سنائے
ہونٹوں پر مسکان سجائے
میں بھی گاؤں تو بھی گائے

آوارہ، اجیارا چندا
کرنوں کا بنجارا چندا
نینوں کی ننھی سیپوں میں
سپنوں کے موتی بھر جائے

چھم چھم چھم چھم گڑیا ناچے
دلہن ناچے، دولھا ناچے
دھرتی امبر دھوم مچی ہے
پھولوں سے بارات سجائے

چھن چھن چھن چھن کنگنا چھنکے
سکھی سہیلی نکلی بن کے
بابا کے آنگن شہنائی
یادوں کے گھنگھرو کھنکائے

پتہ:

63 Hamilton Avenue
Surbiton, Surrey
KT6 7PW England

□□□

قومی اردو کونسل کی چند نئی مطبوعات

افادات	خورشید لکھنوی	صفحات 106	قیمت -/62
جامع التذکرہ (جلد اول)	پروفیسر محمد انصار اللہ	680	-/255
جامع التذکرہ (جلد دوم)	پروفیسر محمد انصار اللہ	384	-/140
توزک جہانگیری (جلد دوم)	ترجمہ اقبال حسین	316	-/230
پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر قمر رئیس	424	-/152
چند تصویریں۔ چند خطوط	سید عمر مہدی	221	-/80
انقلاب 1857	شیخ حسام الدین	136	-/80
وضاحتی کتابیات (جلد پنجم)	مظفر حنفی	522	-/204
اذہان فروزاں	اے۔ پی۔ جے عبدالکلام	128	-/97
فانی بدایونی	مغنی تبسم	500	-/210
کلیات علی سردار جعفری (جلد دوم)	مرتب: علی احمد فاطمی	534	-/200
کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)	شمس الحق عثمانی	566	-/285
بحر الفصاحت (جلد اول)	تدوین: کمال احمد صدیقی	800	-/360
بحر الفصاحت (جلد دوم)	تدوین: کمال احمد صدیقی	822	-/370
کلیات مصحفی (جلد پنجم)	نور الحسن نقوی	92	-/85
کلیات مصحفی (جلد ششم)	نور الحسن نقوی	338	-/236
کلیات مصحفی (جلد ہفتم)	نور الحسن نقوی	398	-/255
کلیات مصحفی (جلد ہشتم)	نور الحسن نقوی	330	-/205
کلیات حسن نعیم	مرتب: احمد کفیل	334	-/185
دیوان تاباں	مرتب: سرور الہدیٰ	414	-/210
آزادی کی نظمیں	سبط حسن	144	-/80
مراۃ العروس	ڈپٹی نذیر احمد	138	-/72
نشاط روح	اصغر حسین اصغر گونڈوی	73	-/49
آئینۂ جہاں (جلد اول)	قرۃ العین حیدر	502	-/230
آئینۂ جہاں (جلد دوم)	قرۃ العین حیدر	612	-/270
آئینۂ جہاں (جلد سوم)	قرۃ العین حیدر	600	-/266
بنات النعش	ڈپٹی نذیر احمد	151	-/78
پرانوں کی کہانیاں (حصہ اوّل)	ساوتری/کلیم اللہ	52	-/30
پرانوں کی کہانیاں (حصہ دوم)	ساوتری/کلیم اللہ	64	-/30
پرانوں کی کہانیاں (حصہ سوم)	ساوتری/کلیم اللہ	64	-/30
عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار	علی احمد فاطمی	393	-/165

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

دائیں سے: جناب حبیب تنویر، محترمہ نسیم بھابیہ،
جناب موسیٰ رضا اور جناب سریش اے کستوانی۔

دائیں سے: پروفیسر شمیم حنفی، جناب گوہر رضا،
سید مجیب احمد، محترمہ ارجمند آرا، محترمہ رشمی چودھری
اور جناب ایس. کے. رے۔

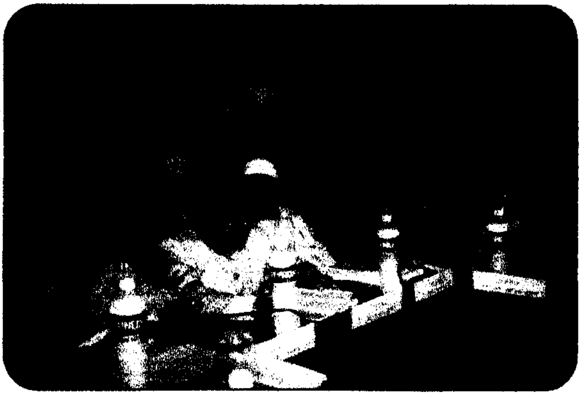

ئیں سے: ڈاکٹر راجیش سچدیوا، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی،
ڈا ناب محمد جلیل پاشا اور جناب شاکر احمد، اے. آئی. آر۔

Date of Publication : 24/07/2007

URDU DUNIYA Monthly, August 2007, Vol. 9, Issue:8

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل حکومت ہند اور
اردو کونسل کے چیئرمین جناب ارجن سنگھ کونسل کی میٹنگ میں
تشریف لاتے ہوئے۔

پروفیسر نسیم بلالیہ وزیر تعلیم جناب ارجن سنگھ
کو گلدستہ پیش کر رہی ہیں۔

میٹنگ کے بعد ہال سے باہر آتے ہوئے
پروفیسر اے. ایم. پٹھان، جناب ممتاز راشد، جناب زبیر رضوی
اور جناب حبیب تنویر۔ زبیر صاحب کو نہ جانے کیا نظر آ گیا ہے
جس کی طرف وہ خوش ہوکر اشارہ کر رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک:8، ونگ:7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938